

صوفوں پر وہ آنے سامنے بیٹھے تھے۔

وہ پہلے سے کہیں زیادہ دہلی اور بیماری لگ رہی تھی۔ شہلا آفریدی کی موت نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ اُس کی شلوار تلے جو گھٹنے تھے ان کی چوکور بناوٹ ابھری ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

اُس کی بیٹی قالین پر آلتی پالتی مارے اپنی ٹھوڑی کو بند مٹھی سے سہارتی ٹیلیویشن پر تیزی سے حرکت کرتے کارٹون پروگرام میں بظاہر کھوئی ہوئی تھی۔

اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔ عابدہ بھی خاموش بیٹھی ایک نظر اُس پر ڈالتی تھی اور پھر چھت کو گھورنے لگتی تھی۔

یکدم... ایک کھٹاک کے ساتھ کھڑکیوں پر مردنی کی بجائے تیز ہوا دھکیلی دینے لگی۔ پھر مرگلہ کی رات میں روپوش پہاڑیوں کے اندھیرے میں سے گھنے سیاہ بادل اترے اور اُن کے ساتھ ہی زمین اور چھتوں میں چھید کر دینے والی تیکھی تیز بارش اُتری اور کھڑکیوں کے شیشے اُس کی کٹیلی بوندوں کی بوچھاڑ کی زد میں آکر ٹوٹنے کو آئے۔ اُس کی مٹھیاں بچنے لگیں اور اکہر ابدن بے اختیار کاپنے لگا اور وہ خوفزدہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جیسے اُس کی مدد کی خواستگار ہو۔ اُس کے ہونٹ نیلے پڑتے جاتے تھے۔

بالآخر وہ بے حد سہمی ہوئی اپنے آپ میں سمٹتی جیسے برہماری میں ایک سُوتی شلوار قمیض میں۔۔۔ گھر سے باہر نکل آئی ہو وہ اُنھ کے پاس آگئی ”مجھے ڈر لگ رہا ہے خاور۔۔۔“ ”مومی۔۔۔ کین آئی گو ٹو بیڈ ناؤ۔۔۔“ بیٹی نے ریموٹ کا بٹن دبا کر سکرین پر حرکت کرتے غل مچاتے کارٹون خاموش کر دیئے۔

”مومی دل ٹیک یو ٹو بیڈ سوئی۔۔۔“ وہ پلٹ کر اُس کی جانب ایک ماں کی والہانہ شفقت سے لپکی اُسے اٹھایا، چوما اور اپنی چھاتی سے لپٹا کر ڈرائنگ روم سے ملحقہ بیڈ روم میں چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو پھر اُسی سلک گاؤن میں تھی جو اُس کے ناتواں گھٹنوں سے اوپر ہی اوپر دم توڑ دیتا تھا۔ اور اُس کے نیچے عیب برہنگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اُس کی نہیں سرمد کی مرید تھی۔

باہر فیڈرل لاج کے درختوں کی ٹہنیاں پانیوں کی بوچھاڑ سے ٹوٹتی تھیں اور بارش کا اندھاؤہند شور کھڑکیوں کے بند شیشوں پر دھکیلی دیتا اجازت بنا سیدھا اندر آتا تھا اور

کانوں کو بہرا کر تا تھا۔

صرف ایک دراز قد لیپ کونے میں ایک پہرے دار کی طرح کھڑا تھا جس کی روشنی بلند دیواروں سے لگ کر چھت تک پہنچنے کی کوشش کرتی تھی۔

وہ ایک رنجیدہ اور سوگ کی حالت میں پھر اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنی ایک ٹانگ کو دوہرا کر کے دوسری پر رکھا تو گاؤن گھٹنوں سے کھسک کر اُس کے کولہوں تک سرک گیا۔

”سائیں آپ ازل سے میرے رازدان ہیں۔۔۔ جب تمہیں پڑھتے تھے تو تمہارے حرف ہم سے باتیں کرتے تھے اور ہم انہیں اپنا راز دل بیان کرتے تھے۔ تمہیں دیکھتے تھے تو تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم سے اپنے دکھ درد کہتے تھے۔ بالکل اسی طرح۔ جس طرح تم سے فون پر باتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی رات بھی ہوگی جب آپ سچ سچ ہمارے سامنے بیٹھے ہوں گے۔۔۔ تم تو نہیں دیکھتے تھے صرف ہم دیکھتے تھے۔ تم بھی تو دیکھو سائیں۔۔۔“ اُس نے اپنے کندھوں سے گاؤن ڈھلکایا اور پھر اُس کی جانب پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئی۔ گاؤن اُس کے پاؤں کے گرد ڈھیر ہو گیا ”دیکھو۔۔۔“

اُس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے نمایاں تھے اور گنے جاسکتے تھے اور اُن کے گرد اُس کی پشت پر عجیب مفلوک سے دھبے تھے جیسے کسی جلدی بیماری کے آثار ہوں۔

”دیکھو سائیں۔۔۔“ اُس نے پیچھے نہیں دیکھا۔ اُس کی جانب پشت کئے کھڑی رہی اور پھر قدموں میں ڈھیر شدہ گاؤن میں سے پاؤں نکال کر پٹی اور اُس کے روبرو ہو گئی۔

اُس کے سارے بدن پر۔۔۔ ٹانگوں پر۔۔۔ چھاتیوں پر۔۔۔ ہر جگہ وہی دھبے نظر آرہے تھے۔ جیسے زخم مندمل ہو رہا ہو تو اُس پر کھرینڈ نمودار ہونے لگتا ہے۔ ایسے دھبے۔۔۔

وہ ایک اتارنی طیب کی طرح سر سے پاؤں تک اُس کا معائنہ کرتا رہا۔

”تم جو دیکھ رہے ہو تمہیں اس پر یقین کرنا پڑے گا۔ کہ نہیں“ وہ ہنسنے لگی۔ اُس کے برہنہ ہونے میں خاور کو کوئی عیب نہ لگا کیونکہ اُس کا بدن ایک بچی کی طرح ڈبلا اور کچا تھا۔ اُس میں کوئی بیجان نہ تھا۔ ”کرامویل ہاسپٹل کا ڈاکٹر اینڈریو کینیڈی۔۔۔ آئرش نیلی آنکھوں والا۔ ایم ڈی۔۔۔ خاص طور پر لنڈن سے فلائی کر کے صرف میرے لئے دو گھنٹوں کے لئے کراچی آیا تھا۔۔۔ اینڈ۔۔۔“ وہ اپنے اکہرے بدن کو ذرا اچھپاتے ہوئے شرمندہ ہو گئی۔

اینڈ ڈیوڈ نوڈیٹ ہی ازان لوو دی.. ہاں.. ڈیز اینڈریو بہت ہی فینس اور معروف ڈاکٹر ہے اور کسی پریڈیٹنٹ یا پرائم سسٹر کے لئے بھی ملک سے باہر نہیں جاتا.. اور وہ میرے لئے آگیا.. اگرچہ اُس کی فیس کا کچھ حساب نہیں.. بس ہم جتنے بھی سانس لیتے ہیں اتنے سو پاؤنڈ اُس کی کنسلٹیشن کے ہوتے ہیں... پھر بھی وہ صرف میرے لئے آگیا.. امریکہ میں جو تازہ ترین تحقیق ہوئی ہے اینڈریو سمجھتا ہے کہ اُس میں کوئی اُمید ہے اور اُس نے اُس کے مطابق مجھے کچھ میڈیسن دی ہیں... ”وہ جھکی اور اپنے پنڈ بیگ کو اٹھا کر اُس کے اندر ٹٹولتی ہوئی.. اس میں سے چند گولیاں اور کیپسول نکال کر انہیں اپنی ہتھیلی پر رکھا اور پھر انہیں پانی کے بغیر پھانک کر نگل لیا.. اور پھر سیدھی ہو گئی ”یہ سب کچھ ایک تاخیری حربہ ہیں.. یہ مجھے بچا نہیں سکتیں.. اور میں جانتی ہوں کہ میں مر رہی ہوں..“

دیت نام جنگ کی سب سے مشہور اور اثر انگیز... اس جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں پر بھاری... تمام تر تجزیوں کی نفی کرتی ہوئی.. ایک تصویر تھی.. ایک دیت نامی بچی... امریکی نیپام بموں کے بھڑکتے شعلوں اور آتش برساتے پس منظر میں سے.. دھماکوں اور اپنے جھونپڑے کی بربادی کے شاک میں منہ کھولے روتی ہوئی بالکل تنگی بھاگتی ہوئی آرہی ہے..

عابدہ سومرو بھی... اُس دیت نامی بچی کی طرح کانپتی... اپنی موت کے خوف سے روتی.. اُس کے سامنے تنگی کھڑی تھی..

اُس کا اکہرا ناچنہ... بے ہجان بدن بھی ایک بچی کا تھا.. خوفزدہ اور ہراساں.. صرف اُس کے پس منظر میں نیپام کی آگ نہ تھی ایک کھڑکی تھی جس کے شیشوں پر مینہ کی منہ زور بوندیں برستی تھیں اور دستکیں دیتی تھیں..

کشتی اگرچہ ٹھہری ہوئی ایک انجانے سکوت کی گرفت میں لگتی تھی لیکن سطح آب پر خاموشی سے کھسکتی رواں تھی..

وہ آخر کار تنگ آبی گزرگاہ سے باہر آئی.. اُس نہر کے اختتام تک آگئی جس کے دونوں کناروں پر سردنوں کے جو ذخیرے تھے ان میں قیام کرتے پرندوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ جب تک وہ وہاں سے گزرتی ہے وہ چو نچیں نہیں کھولیں گے... اور جھینگر بھی جان بوجھ

کر فر آنے سے باز رہے تھے.. اور پھر وہ تنگ آبی گزرگاہ میں سے نکل کر سندھ کے لشکیلے.. کراں تاپہ کراں.. پھیلے ہوئے.. گنگ کر دینے والی وسعت کے حامل چوڑے دھارے میں داخل ہو گئی.. یہ دریائے تھا.. ایک بے انت پانیوں کا پھیلاؤ افق تک جاتا تھا.. کر دھار غل پر زمین کا کوئی وجود نہ تھا صرف پانی تھے.. ایک سمندر تھا..

اس کا کنارہ... تمنا کے دوسرے قدم کی طرح کہاں تھا.. کشتی جو کناروں کے درمیان رواں ہونے کی عادی تھی اُس میں داخل ہوئی تو جھجک گئی اور اُس کے درمیان میں جا کر اپنی قسمت آزمانے کی بجائے کنارے کے ساتھ لگ لگ کر چلنے لگی..

فہیم کسل مندی سے بیدار ہوا.. ایک انگڑائی لے کر اٹھا اور کسی سے کچھ کہے سنے بغیر اپنی نیوب کو سینے سے لگا کر دریا میں کود گیا..

ایک غراپ کی سی آواز آئی اور وہ پانیوں میں گم ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کشتی سے کچھ فاصلے پر دریا میں سے ابھر اور تیرتا ہوا دور ہونے لگا..

خاور جو کشتی کی نوک پر بہت بنا کھڑا تھا.. اور یکدم نہر میں سے باہر آکر سامنے کے وسیع آبی پھیلاؤ کی حیرانی میں تھا.. اس غراپ کی آواز پر پلٹا اور جعفر کی جانب سوالیہ نگاہیں کیں..

”سامنیں حوصلہ رکھو...“ جعفر کو کشتی کو کنارے کے ساتھ ساتھ رکھنے میں بہت زور لگانا پڑ رہا تھا ”فہیم اپنے گاؤں کو جاتا ہے.. آپ کے لئے دیسی مرغی اور انڈے لانے کے لئے... پڑاؤ کرنے تک لوٹ آئے گا“

سندھ کا پاٹ اتنا وسیع تھا کہ دور دور تک کسی کنارے کسی آبادی کا نشان نہ تھا.. اور فہیم.. نکلا مکان کے صحرایی آبی وسعت میں ایک نیوب کے سہارے تیرتا دور ہوتا چلا جاتا تھا..

اُسے شہر میں دیر ہو گئی تھی.. اگرچہ تقریب کے بعد ایک نہایت پر تکلف ڈنر کا اہتمام تھا اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ

اُس کی بے حد مرغوب غذا کیسے ٹھیکل پر سج رہی ہیں۔ لیکن وہ سب کی سب بھاری چربی والی اور تلی ہوئی تھیں۔ اُس کی بھوک کو اُن کی ہال کے اندر آتی اشتہا انگیز مہک بہت بے چین کرتی تھی لیکن اُس نے اپنے آپ پر جبر کیا۔ اُسے سختی سے ان چیزوں کی منائی تھی۔ اُس کے خون میں چربی کے مادے گھنے ہو رہے تھے اور وہ کہیں نہ کہیں کسی وقت بھی رکاوٹ ڈال سکتے تھے۔ زندگی کو ہلاک کر سکتے تھے اس لئے اُسے منع کر دیا گیا تھا۔

میزبانوں نے بہت اصرار کیا صرف چند لقمے لے لینے پر اصرار کیا لیکن وہ جانتا تھا اپنے آپ کو جانتا تھا کہ اگر ایک بار اُس نے ہاتھ میں پلیٹ پکڑ لی تو پھر وہ ہر قسم کی احتیاط تیار دے گا اور چند لقموں تک محدود نہیں رہے گا اس لئے اُس نے معذرت کر لی۔ گھر میں کچھ عزیز متوقع ہیں دراصل میری بیٹی کے سرال۔ اور کھانا مجھے اُن کے ہمراہ کھانا ہے بلکہ فوری طور پر واپس جا کر بندوبست کرنا ہے۔

مونگیا رنگ کے پھانک کے قریب پہنچ کر وہ جو نبی بریک لگاتا تھا تو بشیر اگرچہ نظر نہیں آتا تھا لیکن پھانک فوری طور پر کھلتا جاتا تھا۔ اُسے ہارن دینے کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی لیکن آج وہ منتظر رہا۔ پھر متعدد بار ہارن دیئے۔ بالآخر اُسے کار سے اُترنا پڑا۔ اُسے یقین تھا کہ بشیر اپنی نئی بیوی میں محو ہو گیا ہے اور کسی ایسے مقام پر ہے جہاں انسان کچھ نہیں سن سکتا۔ اُس نے متعدد بار گھنٹی پر دباؤ ڈالا اور پھر بھی بہت دیر بعد بشیر برآمد ہوا۔ اُس نے خاموشی سے پھانک کھولا اور پھر اُس کے ساتھ معمول کی گفتگو کرنے یا اُس دن کی رپورٹ پیش کرنے کی بجائے کہ صاحب فلاں فلاں نے فون کیا تھا۔ فلاں ملنے آئے تھے اور رات کے کھانے کے لئے میں نے یہ کچھ تیار کیا ہے اور آپ کھانا کتنے بچے کھائیں گے۔ وہ کچھ کہے بغیر اپنے کوارٹر کی جانب جانے لگا۔

”بشیر۔“

”جی صاحب۔“

وڈر اننگ روم میں داخل ہوا تو بشیر اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

”تم کہاں تھے؟“

”کہیں بھی نہیں صاحب۔ بس۔۔۔“

”اپنے کوارٹر میں تھے۔ بیگم کے پاس؟“ اُسے غصہ آ رہا تھا کیونکہ بشیر کبھی بھی اتنا

رُوکھا اور لا پرواہ نہیں ہوا تھا۔

”نہیں جی۔۔۔ ادھر ڈرائنگ روم میں تھا اور۔۔۔ فون سن رہا تھا۔“

خاور نے اُس لمحے اپنے غصے میں سے باہر آکر بشیر پر نگاہ کی۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ درہم درہم اپنی ہچکیوں کو دبانے کی کوشش میں تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ ”وہ فوراً اُسکے قریب ہوا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔ بشیر جیسا بھی تھا ایک ہمدرد اور غمخوار انسان تھا۔ اور ایک مدت سے اُس کی ملازمت میں تھا۔“

”کچھ نہیں صاحب۔۔۔“ اُس نے ایک اور ہچکی لی اور رومال سے تادیر اپنی ناک صاف کی۔

”کس کا فون تھا؟“ یہ پوچھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہ نے اُس تپائی کی جانب سفر کیا جس پر فون رکھا ہوا تھا۔ چونگا کر یڈل پر نہ تھا۔ اپنے دونوں منہ چھت کی جانب کئے چپٹ پڑا تھا۔

”ہیلو۔“ اُس نے چونکا اٹھا کر آہستہ سے کہا۔

”یہ تم ہو سائیں۔۔۔ میں بشیر سے باتیں کر رہی تھی۔ تم گھر پر نہیں تھے تو میں اُس سے باتیں کرتی رہی۔“

تم آرام کرو سائیں ابھی ابھی لوٹے ہو۔۔۔ میں دوبارہ کروں گی۔“

بشیر ابھی تک سر جھکائے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ خاور نے پہلے تو سوچا کہ وہ اُس سے دریافت کرے کہ وہ کیا باتیں کر رہی تھی پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو اپنی اس خلوت میں داخل کرنا مناسب نہ سمجھا ”کھانا ابھی لگا دو۔۔۔ جو کچھ بھی ہے۔“

بشیر فوری طور پر کچن میں جانے کی بجائے کھڑا رہا۔ اور پھر نہایت غمناک لہجے میں بولا۔ کم پڑھے لکھے لوگ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر دوسروں کو بیوقوف بنانے کا گرا نہیں جانتے اور جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں اُن کے چہروں پر عیاں ہوتا ہے۔ اور اُس کے چہرے پر کسی حد تک ایک ناپسندیدگی تھی ”صاحب آپ ان بی بی جی کا کچھ کر لیں۔۔۔ بہت برے نصیب والی ہیں۔۔۔ بہت دکھی ہیں۔“

خاور کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں۔ اُس نے پتہ نہیں کیا کیا اس بشیر سے

کہا تھا کیا تھیر لگایا تھا۔ اسی لئے وہ آبدیدہ تھا۔ اُس نے عابدہ سومرو کو اس لمحے سخت ناپسند کیا جس نے اُسے ایک ملازم کے سامنے کھڑے میں کھڑا کر دیا تھا۔

”اگر اُس نے میرے لئے فون کیا تھا تو تم نے صرف یہ کہنے کے سوا کہ میں فی الحال گھر پر نہیں ہوں اور اپنا نام بتا دیں۔ اس کے سوا تم نے گفتگو کو آگے کیوں بڑھایا۔“

”وہ ہمیشہ مجھ سے باتیں کرتی ہیں جی۔“

”انہیں پتہ ہوتا ہے جب آپ گھر پر نہیں ہوتے تو وہ مجھ سے باتیں کرنے کے لئے فون کرتی ہیں۔ صاحب وہ بہت نیک دل بی بی ہیں اور آپ اُن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کر رہے۔ بہت دکھی عورت ہیں صاحب جی۔ اُن کا خاوند اُن کو لنڈن کے ہسپتال میں دیکھنے تک نہیں آیا۔ اُن کی سیمپلی فوٹ ہو گئیں صاحب جی۔“ بشیر کے آنسو پھر اُبل پڑے۔ ”اور وہ مر رہی ہیں جی۔ آپ اُن کا کچھ کر لیں۔ شریفاں خاتون بھی ان کے لئے روتی رہتی ہے اُن کی زندگی کی دعائیں کرتی رہتی ہے۔ وہ تو میرے ساتھ بھی میل ملاپ کے قصے بھول گئی ہے اُن کے ڈکھڑے سن سن کر۔۔۔“

”وہ۔۔ تمہاری بیوی کے ساتھ بھی باتیں کرتی رہتی ہے؟“

”جی صاحب جی۔ ایک عورت کا ڈکھ تو ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے ناں۔ وہ کہتی تھی تم میری طرف سے صاحب جی کی منت کرو کہ وہ بی بی کو بچالیں۔ میں کھانا لگاتا ہوں جی۔۔“

اُس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتا رہا۔ یہ عجیب سی صورت حال تھی۔ عابدہ سومرو کیا کر رہی تھی۔ کیوں ایسا کر رہی تھی۔ اُس کی ذاتی زندگی میں کوڑ کھول کر بشیر کو۔۔۔ حتیٰ کہ اُس کی بیوی کو۔۔ جس کی شکل بھی اُس نے مشکل سے دیکھی ہوگی۔ کیوں داخل کر رہی تھی۔ پاگل خانہ بالکل پوشیدہ تھی اُسے اُس کا نام بھی معلوم نہ تھا اور عابدہ بالکل برہنہ تھی اُسے ہر کوئی دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے ملازم بھی۔۔

حسب معمول گئی رات ٹیلی فون کی گھنٹی بلند ہوئی اور وہ منتظر تھا۔

”ہیلو۔۔ بھاری کراہتی ہوئی آواز۔۔ جس کا وہ منتظر تھا۔

وہ برس پڑا۔۔۔

”سنو تو سہی سائیں۔۔ ہماری بھی تو سنو۔۔“ اُس کی آواز میں اُس کے برسنے سے۔۔ اُس کی شدید ناراضگی اور غصے سے کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ کوئی متوج نہ آیا۔ وہ دھیرج میں ہی رہی۔ ہمیشہ کی طرح ایک بچے تلے ٹھہراؤ میں ہی بولتی رہی ”سائیں ہم کیا کریں۔۔ آپ گھر میں نہ ہوں تو ہم کیا کریں۔۔ یونہی اپنے کمرے کی قید میں مرتے رہیں۔۔ کچھ بھڑاس نکال لیتے ہیں صرف اس لئے کہ غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست۔۔ ہم تو بوئے دوست سے باتیں کرتے ہیں اُن کے ساتھ تو نہیں کرتے اور آپ خواہ مخواہ جلال میں آگئے۔ اور سنو سائیں۔۔ مرشد کے در پر بیٹھے کتے بھی ہمیں پیارے لگتے ہیں۔۔ صرف اس لئے کہ وہ در پر بیٹھے ہیں۔۔ نصیب والے ہیں اور ہم اُس در سے دور ہیں۔۔ دھتکارے ہوئے ہیں۔۔ تو کتوں سے باتیں کرنے پر آپ خفا ہوتے ہیں تو آئندہ نہیں کریں گے۔۔“

اُس کا کھولتا ہوا غصہ جو بدن کی دیکھی کے کناروں سے اُبل کر باہر آ رہا تھا۔ ٹھنڈا ہونے لگا۔ اس میں حرج کی کوئی ایسی بات نہ تھی۔ اُس پر جو گزر رہی تھی۔ تنہائی اور موت کے شکنجے میں وہ جو جکڑی ہوئی تھی اگر اُس نے بشیر اور اُس کی بیوی کو اس میں شریک کر لیا تھا تو قصور نہیں کیا تھا۔ ڈوبتا ہوا شخص ہر شے کو سہارا سمجھتا ہے۔ بچانے والی کشتی اگر دور ہو تو اُسے ہاتھ پاؤں مارنے سے آپ روک تو نہیں سکتے۔

”تم کیسی ہو؟“ اُس نے اس سوال میں اپنی معذرت اور کسی حد تک یکدم غصے سے پھٹ پڑنے کی شرمندگی کو سودیا۔

”مرشد نے پوچھ لیا کہ تم کیسی ہو تو۔۔ ہم جی اٹھے۔ بے شک مر رہے تھے لیکن آپ کے پوچھنے سے جان واپس آ گئی۔ کہاں گئے تھے؟“

”ایک بے مقصد سی تقریب تھی۔ جس میں جانے سے حاصل حصول کچھ نہیں ہوتا۔۔ صرف منتظمین کے بار بار فون کرنے سے۔۔ درخواستیں کرنے سے انسان مجبور ہو کر چلا جاتا ہے تاکہ اُسے متکبر اور بددماغ نہ سمجھا جائے۔ وہیں دیر ہو گئی۔“

”سائیں ایک تو آپ پرانے فیشن کے ہیں۔۔ ڈرائنگ روم میں تپائی پر پڑا ٹیلی فون تو اب ایک پتھر ہے۔ اس میں جان نہیں ہے۔ آپ موبائل کیوں نہیں رکھتے تاکہ آپ جہاں بھی ہوں ہم آپ کے سانس سن سکیں۔“

”میں موبائل انورڈ نہیں کر سکتا۔ وہ ہنسنے لگا۔ اُس کی ناراضگی اور غصہ اُس کی باتوں

کی حدت سے پکھل کر بہہ چکا تھا۔ اور یوں بھی گھر سے نکل کر میں چاہتا ہوں کہ میں ذرا لا تعاق ہو جاؤں۔۔۔ موبائل کی کھنٹی مجھے دنیا کی بھدی ترین آواز لگتی ہے۔۔۔ میرے رگ و ریشہ کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔۔۔

”میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ آپ بہت بھولے ہو سائیں۔۔۔ کسی اور دنیا میں دھونی رمائے بیٹھے ہو اور اُس کے باہر ایک اور دنیا ہے جہاں سے میں تمہیں فون کرتی ہوں۔۔۔ بھدی آوازوں والے موبائل تو شوخے اور نو دو لیئے لوگ رکھتے ہیں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے۔۔۔ ایسے موبائل بھی ہیں کہ سینے کے ساتھ لگائے رکھو تو بولے بولے دستک دیتے ہیں اور آس پاس کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔۔۔ میں صرف اجازت مانگتی ہوں۔۔۔ کل سویرے تمہاری چوکھٹ پر ایک ایسا موبائل دھرا ہو گا۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ مجھے واقعی اس کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ پہلے ہی تم نے جو پرفیوم اور یو ڈی کلون بھیجے ہیں وہ زندگی بھر کے لئے کافی ہیں۔۔۔ تم کیسی ہو؟“ اُس نے پھر پوچھا۔۔۔

اُس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔۔۔
”ہیلو۔۔۔“ وہ لائن پر تو تھی لیکن بولتی نہ تھی ”عابدہ۔۔۔“
”جی سائیں۔۔۔“

”تم اب کیسی ہو؟۔۔۔ پہلے سے بہتر ہو؟۔۔۔ شہلا کے جنازے پر تو نہیں گئی تھی؟“
”نہیں سائیں آپ نے منع کر دیا تھا تو میں نہیں گئی۔۔۔“ اُس نے ذرا سوچ کر رکتے رکتے کہا ”سائیں آپ اب تو غصے میں نہیں؟۔۔۔ میں ڈر گئی تھی سائیں۔۔۔ آپ غصے میں نہ آیا کرو میری جان نکل جاتی ہے۔۔۔ سنو سائیں۔۔۔ میں جو آج بار بار فون کر رہی تھی اور آپ گھر پر نہیں تھے تو میں مجبوراً بشیر کے ساتھ باتیں کرتی رہی تو ایک وجہ تھی۔۔۔ سائیں میں نے ایک درخواست پیش کرنی تھی۔۔۔“

وہ پھر چپ ہو گئی۔۔۔

”تم حکم کرو سائیں۔۔۔“ اُس کا وجود جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔۔۔ جو کبھی زوال سے آشنا نہیں ہوتا۔۔۔ جس کے لب پتھریوں کی طرح ہمیشہ کھلے رہتے ہیں کبھی پڑمردہ نہیں ہوتے اور جس کے دانت سلامت رہتے ہیں بدن کسا ہوا رہتا ہے اور جو کچھ آئینے میں دیکھتا ہے اس پر یقین نہیں کرتا صرف اپنے اندر سے اٹھنے والی آتش صفت ہو کر پر یقین رکھتا ہے جو کبھی

راکھ نہیں ہوتی۔۔۔ اُس وجود کی بولی میں وہ کھٹکتا ہوا بولا ”یہ تو۔۔۔ تو من شدی اور من تو شدی والے معاملات ہیں جن میں یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ مرشد کون ہے اور مرید کون ہے۔۔۔ ہم تو اُس چھڑے برساتی تیز بارش کے بھی مرید ہیں جو آپ کی کھڑکیوں کے شیشے توڑتی تھی۔۔۔ اور عیب برہنگی کے بھی چاکر ہیں۔۔۔ تو آپ حکم کریں سائیں۔۔۔“

جواب میں جو کچھ اُس نے کہا اُسے سن کر اُس کا برقرار وجود برقرار نہ رہا۔۔۔ زوال آشنا ہوا۔۔۔ لب پڑمردہ ہو گئے۔۔۔ دانت ہلنے لگے بدن ڈھیلا پڑ گیا اور وہ لحد وجود میں آگرا۔۔۔
”سائیں تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ۔۔۔ میرے مرنے کے بعد تم میری بیٹی کا خیال رکھو گے۔۔۔ پلیز۔۔۔“

”یار تم حوصلہ رکھو۔۔۔ تم اپنی اولاد کا خود خیال رکھو گی۔۔۔ مجھے یقین ہے۔۔۔“

”نہیں خاور۔۔۔ تم نے تو وعدہ ہے دیکھے ہیں ناں میرے بدن پر۔۔۔ خدا بخش نے کبھی نہیں دیکھے کیونکہ وہ ایک عرصے سے میرے نزدیک نہیں آیا۔۔۔ ڈاکٹر اینڈریو نے بھی مجھے۔۔۔ میرے گال پر بوسہ دے کر میرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا تھا کہ۔۔۔ ڈیز گرل میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ تمہیں ایک عام مریض نہیں سمجھتا اس لئے بتا رہا ہوں کہ یہ گولیاں اور کیپسول چند دنوں کے لئے تاخیر کر سکتے ہیں لیکن انجام نہیں بدل سکتے۔۔۔ تم جو کچھ طے کرنا چاہتی ہو کر لو۔۔۔ سائیں آپ وعدہ کرو کہ میرے بعد آپ میری بیٹی کا خیال رکھو گے۔۔۔“
اُس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور اطمینان تھا۔۔۔ ایک ناقابل واپسی زندگی کی حقیقت جان لینے کا اطمینان۔۔۔

”آئی پراس۔۔۔“

اگلی دوپہر زیر پوائنٹ کی دھوپ اور ویرانی میں۔۔۔ جب کہ وہ ٹکونی لمبی دم والا کرلا منتظر تھا کہ کب چٹان کی قربت میں کھڑے یہ دو انسان غافل ہوں اور کب میں ریٹکتا ہوا تار کول کی سڑک کو پار کر جاؤں اُس نے پچھلی شب عابدہ کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی اُس کا تفصیلی تذکرہ کیا۔

اُس کی غلافی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔۔۔ جھلکنے لگیں۔۔۔

وہ اپنے کالج دنوں کے زمانے سے اُس کے لئے بھڑکنے والے الاؤ کو بھجوا دینے پر

پچھلی شب کی مانند ریت کا ایک چھوٹا سا کوبان پانیوں میں ابھرا ہوا نہ تھا.. بہت وسیع تھا..

اس لئے فہیم یہاں بے خطر جھومر ڈال سکتا تھا اور وہ ڈال رہا تھا..

جعفر پانی میں لڑھک جانے کے خدشے سے بے نیاز بوٹی پی سکتا تھا اور وہ پی رہا تھا..

فہیم جھکا ہوا چہرے کو ایک جانب کئے ہوئے جیسے پیچھے مڑ کر دیکھ رہا ہو.. دونوں ہاتھ فضا میں اٹھائے پاؤں مارتا جھومر ڈالتا تھا.. مرغابی کی موت ایڈورٹائز ہو رہی تھی..

چونکہ وہ حلال تھی اس لئے اسے ذبح کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی.. صرف گردن کاٹ کر اس کی بے مثال چونچ اور ابھی تک زندہ کانچ کی آنکھوں سمیت اسے پرے پھینک دیا گیا اور پھر پروں کو نوچ کر اسے صاف کر لیا گیا.. ان پروں کے گچھے اور اکاد کا پر اس ریت پر بکھرے ہوئے تھے جس پر فہیم رقص کر رہا تھا اور اس کے پاؤں اُن پر پڑتے تو اُن کی پر جوش زد میں آکر کوئی ایک پُر ذرا بلند ہوتا.. اس کا رنگ کچھ بھی ہو سکتا تھا.. سیاہ، بھورا، نارنجی یا چمکیلا سرمئی.. یا سفید بھی.. اور پاؤں کی دھمک سے اٹھتا ہوا میں کچھ دیر ٹھہرا رہتا اور الاؤ کی روشنی سے زندہ لگنے لگتا.. یہ پُر بھی ایک مرغابی تھی جو ابھی تک اُڑنے کی سعی کرتی تھی.. اپنا گل نہ سہی ایک جز سہی پھر سے پرواز کرنے کی کوشش کرتی تھی..

خاور گھٹنوں پر سر رکھے مسحور ہوا صرف فہیم کے پاؤں کو تکتا تھا اور انتظار کرتا تھا کہ کب کوئی ایک اور پر اس کے تلووں کے نیچے سے جنم لینے والی ہلکی ہوا کی زد میں آکر ریت میں سے بلند ہو اور الاؤ کی روشنی میں ظاہر ہو.. ڈولتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا جائے.. وہ جس نے انسان کو پانی کی ایک بوند سے تخلیق کیا تھا اور روز حشر اس کی ہڈیوں کو سمیٹ کر پھر سے زندہ کر دینا تھا.. یہ بھی کر سکتا تھا کہ اس پر ندے کے سارے پُر جو ریت پر بکھرے ہوئے ہیں انہیں بھی سمیٹ کر اسے پھر سے بنا دے، تیار کر دے، زندہ کر دے اور اسے اپنے آبائی گھونسلے کہیں جھیل بیکال کے سرکنڈوں میں منتظر گھونسلے کی طرف لوٹا دے..

جب تک یہ نہیں ہوتا تھا وہ فہیم کے پاؤں میں سے اٹھنے والے ہر پُر سے وہی ایک مرغابی تخلیق کرتا تھا اور اسے اس جزیرے کی گھنی رات میں سے بلند کر کے اُن بلند یوں پر بھیجتا تھا جہاں سے راستے سیدھے اس کے گھونسلے کو جاتے تھے..

ایک مرغابی کا اگرچہ خوشی سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن وہ اس کے لئے از حد آزرده

ہو رہا تھا.. اور یہ آزرده کی کتنی جعلی اور کھوٹی تھی.. ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اسی مرغابی کا گوشت دیسی گھی میں بھنا ہوا ہانڈی سے اُترا تھا اور اس میں اُن اُپلوں کی بو تھی جو پکھٹی کے ہاتھوں نے سلگائے تھے تو اس نے اسے کتنی رغبت سے کھایا تھا.. ایک ایک ہڈی چوس تھی.. کسی بھی احساس جرم کے بغیر.. چنانچہ دراصل وہ خود ہی وہ شکاری تھا جس نے بنا جھجک اسے مار گرایا تھا.. اور اب خود ہی آزرده ہوا تھا کہ اس آزرده کی کے لئے حس جہال ایک بہانہ تھی ورنہ زبان کے ذائقے نے تمام جمالی اخلاقیات کو.. کسی بھی احساس جرم کے بغیر تہ تیغ کر دیا تھا.. اور اب وہ شرمندہ محسوس کر رہا تھا.. قتل کرنے کے بعد شرمندگی کی آڑ میں اُلٹا ثواب لے رہا تھا..

اس احساس میں کہیں بھی یہ ضمانت نہیں تھی کہ اگر کل رات بھی اس کے سامنے دیسی گھی میں بھنی ہوئی ایک اور مرغابی ہانڈی سے اُترتی ہے تو وہ اسے کھانے سے پرہیز کرے گا.. وہ اپنی خصلت کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا اور اُسی خصلت میں جو آزرده کی تھی وہ بھی اس کے بس سے باہر تھی..

جہاں کشتی بندھی تھی.. دونوں خیمے تاریکی میں تھے، چو لہا جلا تھا اور مرغابی کے پروں کے گچھے کچھ ریت پر پڑے تھے اور کچھ فہیم کے رقص کرتے پاؤں کے طفیل ہوا میں بلند ہو کر سندھ کے سیاہ پانیوں میں جا اترے تھے اور اُن پر بہتے ہوئے جانے کہاں تک چلے گئے تھے.. دریا کا ایک بہت چوڑا میدان نما رہتا تھا.. بہت دور جا کر یکدم اونچا ہوتا تھا اور وہاں سے سروٹوں کے ذخیرے کا آغاز ہو جاتا تھا..

فہیم حسب معمول جھومر ڈالنے کا فرض ادا کر کے ہانپتا ہوا بیٹھ گیا..

”میں اپنے گاؤں سے ہو کر آیا ہوں سائیں.. پورے گاؤں میں گھوم گیا پر ایک مرغابی بھی نہ ملی.. اندوں والی مرغیاں لوگ فروخت نہیں کرتے.. پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ غلام محمد شمر سے پتہ کروں اس کے پاس تو دنیا جہاں کی مرغیاں جمع ہوتی ہیں.. خود نہیں پاتا سائیں.. اس پاس کے گاؤں سے کھیتوں سے پکڑا لاتا ہے کہتا ہے کہ آوارہ مرغیاں تھیں.. تو آج اس کا صحن بھی خالی تھا.. واپسی پر دریا میں ٹہلتا آ رہا تھا تو سوہنے رب نے یہ تحفہ تیرا بھیج دیا..“

”عجیب سا نام ہے غلام محمد شمر..“

کھلی تودانتوں سے کھولا... اُس میں ایک مرغابی تھی.. گردن ڈھکی ہوئی تھی، چونچ سے پانی بہہ رہا تھا اور اُس کی پرکشش آنکھیں زندہ اور کھلی تھیں.. "مرغی نہیں ملی ناں تو مایوس واپس آرہا تھا.. تو میں تیرتا ہوں تو یہ میرے آگے سے بہتی ہوئی جارہی ہے.. میں نے تھوڑا پیچھا کر کے اسے پکڑ لیا.. کسی شکاری کے فائر سے زخمی ہو کر گری ہے تو سندھ پر گری ہے اور وہ اسے نکال نہیں سکا اور یہ بہاؤ کے اندر آکر اُس کی چونچ سے دور ہو گئی ہے.. دیکھیں.. اُس نے مرغابی اٹھا کر اُس کا ایک تیز دھڑکتے رنگوں والا پر چٹکی میں لے کر اونچا کیا "اور ہر... اڑتے ہوئے پر کے نیچے چھڑے نے مار کی ہے... حلال ہے سائیں شکاری پڑھ کر فائر کرتے ہیں... ہاتھ لگا کر دیکھیں ابھی گوشت میں گرمی ہے.."

خاور نے ہاتھ بڑھا کر اسے محسوس کیا.. پر کے نیچے.. ابھی تک زندگی کی کچھ حرارت باقی تھی اگرچہ زندگی رخصت ہو چکی تھی اور یہ حرارت اُس کی انگلیوں کی پوروں کے راستے سارے بدن میں پھیلتی گئی اور ایک شاہکار پرندے کی مرگ پر ماتم کرتی گئی.. اُس کے چوہ نما پنچے حیرت انگیز طور پر کسی کھلونے کے لگتے تھے بڑے بڑے لگتے تھے... چونچ پلاسٹک کی لگتی تھی.. البتہ کھلی آنکھوں میں کوئی شک نہ تھا انہیں کوئی کاریگر نہ بنا سکتا تھا.. وہ زندہ اور دیکھتی تھیں..

انسان اپنی متوقع موت کو کتنا مشتہر کرتا ہے.. اپنے آپ کو اور دوسروں کو زلاتا ہے کہ... اوڑک جاناں مروے چل میلے نول چلے... لیکن اپنے سے کہیں بڑھ کر مناسب... پرکشش اور خوبصورت... اور اس دنیا میں رہ جانے کے حقدار پرندے کا نشانہ لگاتے ہوئے ذرا نہیں جھکتا... بلکہ اُس کی مرگ پر شاداں ہوتا ہے اور فخر کرتا ہے.. اگر اس مرغابی کو پہلے سے علم ہو جاتا کہ مجھے مرنا ہے.. آج اتنے بچ کر اتنے منٹ پر.. جب میرے نیچے پھیلے دریا کو دھوپ نے سفید آگ سے ڈھک رکھا ہو گا تو چند چھڑے میرے دائیں پر کے نیچے میرے بدن میں داخل ہو کر میری آنکھیں پتھر ادریں گے، پنچوں کو بے جان کر دیں گے اور میں دریا کی سفید آگ میں گر کر ٹھنڈی ہو جاؤں گی تو کیا یہ مرغابی بھی ٹرلاتی.. اپنی متوقع موت کو مشتہر کرتی...

جزیرہ جس پر رات آئی بہت بڑا تھا..

تیار ہو گئی.. پچھلی شب کی درخواست سننے کے بعد وہ عابدہ سومرو کے حق میں دستبردار ہونے کو... اپنی رضا سے اور خوشی سے تیار ہو گئی..

"تم نے اُس کے آخری دنوں میں.. جیسے بھی ہو خوش رکھنا ہے.. اُسے دکھ نہیں دینا اُس کا خیال رکھنا ہے.. اُس کی بچی کو سنبھالنا ہے.."

"اور اُس کی غلامی آنکھوں میں پانیوں کا اتنا ذخیرہ کبھی نہ تھا جو اُٹتا ہوا.. ایک سیلاب کی صورت اُس کے گالوں پر ایک ندی کی طرح بہتا تھا.. پاگل خانے کی نظروں میں.. بشیر اور اُس کی شریقاں خاتون کی نگاہوں میں وہ مجرم ٹھہر گیا تھا.. اُس کے خلاف ایک جذباتی بغاوت ہو چکی تھی کہ وہ کیوں اس دکھیا اور قریب المرگ عورت کے لئے کچھ نہیں کرتا.. اُس کے لئے دو کیوں نہیں ہوتا.. لیکن دو کیا تھی؟..

ذہلی دھوپ میں سندھ پارے کا ایک سمندر تھا.. آنکھ اُس پر ٹھہرتی نہ تھی.. جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شگاف پڑنے سے پٹرول بہہ نکلے اور دور دور تک سمندر کی سطح پر پھیل جائے اور پھر کوئی ماچس کی ایک جلتی ہوئی تیلی اُس پر پھینک دے اور وہ بھڑک اٹھے.. ایسے سندھ کے پانی ذہلی دھوپ میں لٹکتے تھے کہ اُن پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی.. اور اس سیماب صفت چمک کو چیرتی اُن کی کشتی تھی..

اور اس تھر تھرتی لٹکتی وسیع پارہ چادر میں تیرتا فہیم تھا جو کشتی کے قریب ہوتا جارہا تھا.. جیسے سیال چاندی میں ڈوبتا ابھرتا بڑی بڑی مونچھوں والا ایک لدھڑ ہو.. وہ جعفر کا بڑھا ہوا ہاتھ تھا مگر عرشے پر آکر اور اُس کے بدن سے نچرنا پانی کشتی کے تختوں میں جذب نہیں ہوا بلکہ سطح پر ٹھہر گیا اور وہ بھی جھلملانے لگا.. جیسے وہ اپنا پارہ ساتھ لے آیا ہو.. تھوڑی دیر اُسی حالت میں پڑا فہیم ہانپتا ہاکیپا تار ہا اور وہ جو اسے دیکھتے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر مسکراتا ہا اور پھر اپنے سر کے بالوں کو یوں جھکا جیسے ایک کتا اتفاقاً پانی میں جا گرے تو وہ باہر نکلتے ہی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے بدن کو خشک کرنے کی خاطر اسے خوب جھٹکتا ہے..

"وہی مرغی تو نہیں مل سکی سائیں.. پر اُس سے بہتر شے مل گئی ہے.."

اُس نے کندھوں پر بندھی چڑتی ہوئی پوٹلی اُتار کر اُس کی گانٹھ کو مشکل سے کھولا.. انگلیوں سے نہیں

چھت ٹپکتی ہے اُس پر لپ کرنے کے لئے گار اتیار کرو... وہیں سے آرہا ہوں اس لئے دیر ہو گئی ہے... چنانچہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی چھٹی ہو گئی کہ اساتذہ سے گھر کا کام کرواتے ہیں..."

ہر علاقے ہر ثقافت اور ہر مذہب کی حس مزاج الگ الگ ہوتی ہے... خاور بھی مرغابی آزدگی سے کسی حد تک باہر آگیا... مسکراتا رہا لیکن سرور اور فہیم نے اگر بوٹی سے بھرا کجا خالی نہ بھی کیا ہوتا تو وہ اسی انداز میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہے ہوتے...

اماں جعفر اس کنبے میں شریک نہ ہوا تھا... اُس نے اپنا بندوبست الگ کیا تھا... کشتی کو کناروں کے ساتھ باندھنے کے عمل سے فارغ ہو کر وہ فوراً کسی آبائی نئے کے مطابق بھنگ گھونٹنے میں مصروف ہو گیا تھا... اس لئے اُس پر رنگ چو کھا آیا تھا... وہ ایک فلسفی کی طرح دریا کے کنارے آہستہ آہستہ چلتا جاتا جیسے کسی کائناتی گتھی کو سلجھانے میں مگن ہو اور پھر بہت دور جا کر ریت پر براجمان ہو کر پانیوں کی سیاہ چادر کو نمکنگی باندھ کر دیکھنے لگتا... پھر ہڑ بڑا کر اٹھتا اور نہایت خوفزدہ حالت میں بگٹ بھگتا اُن کے قریب آ جاتا... اُنہیں دیکھ کر ہنستا اور پھر سے فلسفی ہو کر دریا کے کنارے چلنے لگتا... اُس نے اپنی ساوی میں کسی کو شریک نہیں کیا تھا...

"گھر کب جائیں گے سائیں..." فہیم ہنستا ہوا چپ ہو گیا... اُسے دیکھا... اور وہ دیر سے چپ تھا...

"کونے گھر؟"

"آپ کا گھر تو ہے ناں سائیں... جہاں سے آپ اور ہمارے دیس میں آئے ہیں..."

"نہیں..."

"جانے دیں سائیں... شمر کی طرح خول تو نہ کریں... بندے بشر کا کوئی نہ کوئی گھر تو ہوتا ہے جدھر وہ لوٹتا ہے..."

"نہیں ہے فہیم... کوئی بھی دیوار... چار دیواری... کوئی ایک چھت اس وقت وجود میں نہیں ہے جو میرا گھر ہو سکے... اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ میں نے کب اور کہاں واپس جانا ہے..."

فہیم نے پہلے تو اس بیان پر قہقہہ لگانے کے بارے میں سوچا کہ بوٹی کی سرمستی نے اُس کے اندر جو دھوم مچائی تھی اُس کا یہی تقاضہ تھا لیکن پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پا کر

"ہاں سائیں... خود بھی بہت عجیب ہے... کہتے ہیں کہ پرانا میڑگی ہے... میں بالکل نہیں سائیں... تو میری طرح گاؤں کے سکول میں ٹیچر ہے... کہنے لگا 'مرغی تو نہیں ہے پر اُدھر سندھ سائیں میں جو مسافر دوست آئے ہیں اُنہیں ملنے میں بھی چلتا ہوں... پر میں نہیں لایا سائیں... شمر کا کوئی اعتبار نہیں..."

"کیوں؟"

"شمر جو ہے... اُس میں شر بہت ہے سائیں... مزاق میں لوگوں کا نقصان کر کے خوش ہوتا ہے... اُدھر گاؤں میں ایک شخص نے کوٹھے ڈالنے کے لئے چھ سات شہتر خرید کر لایا اور گھر کے سامنے ڈال دیئے... شمر نے وہ شہتر دیکھے تو ترکھان کے پاس چلا گیا... بیس روپے پیشگی ادا کئے اور کہنے لگا 'بیٹے فلاں جگہ میرے شہتر پڑے ہیں اُنہیں آری سے چھوٹی چھوٹی تختیوں میں کاٹ دو بچوں کو دینی ہیں پر یہ کام صبح نو بجے سے دو بجے تک ہو جانا چاہئے... ترکھان نے یہ کام کر دیا... ڈھائی بجے وہ شخص کام سے واپس آیا تو اُس نے سر پیٹ لیا... ہزاروں روپے کی مالیت کے شہتر بیکار قسم کی تختیوں میں بدل چکے تھے... اور پھر بقیہ مزدوری لینے کے لئے ترکھان بھی پہنچ گیا..."

"شمر کی بات کرتے ہو فہیم..." سرور اندھیرے میں سے باہر آکر الاؤ کی راگھ ہوتی لکڑیاں پلٹنے لگا... اور ہنسنے لگا...

"ہاں..."

"سائیں کو وہ بتاؤ ناں کہ شمر حجام کے پاس جاتا ہے... پہلے بال کٹواتا ہے... پھر اُن کو دھلاتا ہے پھر کہتا ہے کہ اب اُسٹرا پھیر کر نڈ کر دو... اور جب اٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے تو صرف نڈ کرائی ہے اور آٹھ آنے دے کر چلا جاتا ہے..."

فہیم بھی ہنسنے لگا... اور اتنا ہنسا کہ دوہرا ہو کر گرنے کو تھا کہ پھر سنبھل گیا... "سائیں پچھلی رات کا خدشہ ابھی تک ہے... وہاں دوہرے ہو کر گرتے تھے تو سندھ میں جاگرتے تھے... یہاں خیر ہے... سائیں شمر کی کیا بات ہے... سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ساتھ دشمنی بنائی... ایک مرتبہ انسپکٹر صاحب سکول کی انسپکشن کو آئے تو شمر ذرا دیر سے آیا اور آیا ہے تو سر سے پاؤں تک کچھڑ میں لت پت کلاس روم میں داخل ہوتا ہے اور کہتا ہے... دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں سرکار... لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیگم نے آج بھی بلالیا تھا کہ گھر کی

بے یقینی کے عالم میں سنجیدہ سی شکل بنائے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ سائیں کیا کہتے ہو گھر تو ہر ایک کا ہوتا ہے.. اُس مرغابی کا بھی ہو گا جو ہم نے بھون کر کھائی ہے..

”تم کیوں پوچھتے ہو فہیم؟“

”سائیں سرور آپ سے بات کرتے ہوئے جھجکتا ہے تو وہ پوچھتا تھا.. کہتا تھا کہ کئی دن ہو گئے ہیں سندھ کے پانیوں میں.. ادھر شکار و کار.. دارو شارو.. وغیرہ کا تو کوئی پروگرام نہیں تو.. صاحب سے پوچھ دو کہ واپس کب ہونا ہے..“

”مجھے نہیں معلوم.. ان لوگوں سے برمانی نے یہی طے کیا تھا کہ جب تک میں کہتا ہوں انہوں نے چلتے جانا ہے.. ان کو ادائیگی ہوتی جائے گی.. تو انہیں کیا غرض ہے کہ کوئی پروگرام ہے یا نہیں.. یہ کشتی کھیتے جائیں..“

”جو حکم سائیں..“ فہیم نے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا کوئی اظہار نہ کیا ”اجازت دو سائیں.. نیند بلاتی ہے“ وہ اٹھا.. اور اُس کے اٹھنے سے.. پاؤں میں بوٹی کی جو مستی تھی اُس کی ٹھوکر سے مرغابی کا ایک اور پر فضا میں بلند ہوا..

فہیم چلا گیا لیکن وہ پر ہوا میں معلق رہا..

جعفر اور سرور بھی اپنی اپنی تاریکی میں اتر گئے.. الاؤ مکمل طور پر راکھ ہو چکا تھا.. کہیں کوئی ایک چنگاری بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اُس کی روشنی کا گمان موجود تھا.. اور اس گمان میں وہ ایک پر دکھائی دیتا تھا.. جس کے بغیر وہ پرندہ روز حشر سمیٹا نہیں جاسکتا تھا.. اس ایک پر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا..

کیا یہ پر تھا یا اُس کے ہونے کا گمان تھا..

”انڈس کوئین“ کا سفر جاری تھا..

وہ بے آواز گزرتی تھی..

اُس کے سنیم انجن کی آواز نہ آتی تھی..

عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی.. معمول کی رونق نہ تھی.. نہ راج کے برتر آقا تھے اور نہ اُن کے آگے جھکے ہوئے غلام تھے.. یہاں تک کہ کموڈ بھی خالی تھا.. البتہ قہقہے اُسی طور روشن تھے اور جھولتے تھے.. دیرانی تھی.. اور عرشے کے درمیان میں ایک بدن پڑا تھا جس پر جابجا دھبے اور کھرینڈ تھے.. نیپام بھوں کی ہلاکت خیز آگ سے فرار ہوتی خوفزدہ.. روتی

ہوئی.. ناتواں ناگوں سے بھاگتی ہوئی ایک برہنہ بچی کا بدن تھا جو عرشے پر پڑا تھا.. غلامی آنکھیں اُس پر جھکیں آنسو بہاتی تھیں..

جیسے ایک پر ابھی تک فضا میں معلق تھا.. یا اُس کا گمان تھا جو ٹھہرا ہوا تھا.. بجھ چکے الاؤ کی مانند..

ایسے انڈس کوئین تھی جو سندھ کے پانیوں پر بے آواز گزرتی تھی..

اور برہنہ بچی کا بدن عرشے پر پڑا تھا.. شاید یہ بھی ایک گمان تھا..

”میرے ساتھ آجائیں سائیں..“

کراچی ایئرپورٹ کے بے ترتیب بھینروں ایسے انسانی اثر و ہام میں سے اپنے آپ کو کھینچتا پچاتا جب وہ باہر آیا اور ایڈورٹائزنگ فرم کے اُس ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا جو ہر ہفتے اُسے ایئرپورٹ پر لینے آتا تھا تو اُس کے سامنے یکدم ایک جن کی طرح گھنی مونچھوں اور شیشوں سے بھری چوکر سندھی ٹوپی اوڑھے ایک شخص نمودار ہوا اور ذرا جھک کر کہنے لگا ”میرے ساتھ آجائیں سائیں..“

اُس نے اُسے ایک نظر دیکھا.. وہ اُس کے چہرے سے ناواقف تھا.. چنانچہ جواب میں اُس نے کچھ نہ کہا.. چپ رہا اور ڈرائیور کو تلاش کرنے لگا.. وہ شخص بھی چپ کھڑا رہا.. اور ایک خاص وقفے کے بعد جواب کے لئے درکار تھا پھر ذرا جھک کر بولا.. ”سائیں آپ میرے ساتھ آجائیں..“

”تم کون ہو؟“

”میں قادر ہوں سائیں آپ کو لینے آیا ہوں.. میرے ساتھ آئیں..“

”کہاں؟“ وہ شکل سے بے حد مخدوش لگتا تھا اور کراچی ایسا شہر نہیں تھا کہ آپ کسی اجنبی کے ساتھ ایک دو فقروں سے زیادہ بات کرنے کا خطرہ مول لیں..

”گاڑی پارکنگ میں ہے سائیں.. آپ کا بیگ اٹھاتا ہوں..“

”نہیں..“

”مہربانی کرو سائیں..“

”تمہیں.. کس نے بھیجا ہے؟“ یہ ممکن تھا کہ فرم کا وہ ڈرائیور چھٹی پر چلا گیا ہو

اور یہ اُس کی جگہ آیا ہو..

”میرے ساتھ آئیں.. سرکار وہیں ہیں...“

سرکار... عابدہ سومر د تھی.. نسان پٹرول کی پچھلی نشست پر سیاہ گوگلز لگائے ونڈ سکرین کے پار دیکھتے ہوئے.. لیکن اُس کا چہرہ روشن تھا خوشی سے دمکتا ہوا.. اُس نے خاور کی جانب دیکھا نہیں لیکن اُس کا پورا وجود اُس کی موجودگی سے آگاہ تھا..

قادر نے نہایت ادب سے دروازہ کھولا اور وہ سمٹ کر ذرا پرے ہو گئی اور خاور اُس کے برابر میں بیٹھ گیا.. وہ بدستور سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی اور اُس کی مسکراہٹ تھمنے میں نہ آتی تھی..

سوائے ونڈ سکرین کے تمام شے سیاہ تھے..

نسان پٹرول ایئر پورٹ پارکنگ سے باہر آ گئی..

وہ اُس کی خاموشی سے تنگ آ گیا ”تم مجھے اغوا کر رہی ہو؟“

”ہاں..“ اُس نے صرف اتنا کہا..

”کیا مطلب ہے‘ ہاں..“ اُسے اُلکھن بھی ہو رہی تھی جو عابدہ سومر کی قربت میں اُسے ہمیشہ ہوتی تھی اور اُسے یوں اچانک قریب پا کر مسرت کا ایک احساس بھی ہو رہا تھا.. اسی لئے وہ اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا..

”اس کے سوا چار ا نہ تھا.. اب مرید کتنی بار مرشد کی چوکھٹ پر جائے..“

”مرید کو یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ مرشد روزی روزگار کے سلسلے میں اس شہر میں آیا ہے.. کسی رومیننگ ایڈونچر کے لئے نہیں..“

”آپ کا روزی روزگار تو ہم ہیں سائیں..“ اُس نے ابھی تک اُسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا اور سامنے نظریں جمائے بُت بن بیٹھی تھی.. ”سائیں آپ ہر ہفتے ادھر ہمارے گاؤں کراچی میں آؤ اور چپکے سے واپس چلے جاؤ.. ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں..“

”بہر حال آج پچھلے پہر چار بجے ایک اشتہاری مہم کے سلسلے میں میری ایک نہایت اہم مینٹنگ ہے..“

”مینٹنگ کینسل بھی ہو سکتی ہے سائیں لیکن مینٹنگ نہیں..“ وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں چلی گئی.. آج اُس کی آواز میں وہ گہری جنس بھری رعبت مفقود تھی اور وہ نہایت نارمل

انداز میں گفتگو کر رہی تھی.. نہ ہی اُس میں کوئی دکھ یا در ماندگی تھی.. بلکہ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنی پرسکون اور زندگی سے اُلٹی ہوئی خوش تھی..

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”میرے منہ پہ رونق نہیں آ گئی..“ اور وہ واقعی روشن ہو رہی تھی ”بیمار کا حال اچھا ہے سائیں.. تمہیں دیکھنے سے“

”ہم جا کہاں رہے ہیں؟“

”جہاں میں تمہیں لے چلوں...“

”میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ مجھے بہر طور وہ مینٹنگ انینڈ کرنی ہے.. میں اُسے کسی حالت میں بھی مس نہیں کر سکتا..“

”آپ کو پہنچا دیں گے سائیں.. ابھی تو بہت وقت ہے.. آپ ہماری راجدھانی میں ہیں.. یہاں ہمارا راج ہے.. ہم زبردستی بھی کر سکتے ہیں..“

”یعنی مجھے واقعی اغوا کیا جا رہا ہے..“

”ہاں..“ اُس نے سر ہلایا اور سامنے ونڈ سکرین پر سیاہ گوگلز میں پوشیدہ آنکھیں جمائے مسکراتی رہی..

طارق روڈ پر گھنی ٹریفک ایک تسلسل اور ایک باقاعدگی سے حرکت کرتی جاتی تھی.. ”میں تمہارے لئے ترس گئی تھی..“ اُس نے پہلی بار اپنی نظریں ونڈ سکرین سے جدا کیں ”سیاہ گوگلز اتارے اور اُس پر بچھ گئی..“

”فار ہیونز سیک..“ اُس نے اپنے آپ کو چھڑایا ”یہ تم کیا کر رہی ہو...“

”ڈرائیور...“

”قادر کے بارے میں فکر مند نہیں ہونا... یہ میرا ہراز ہے.. جیسے حرم سراؤں کے خواجہ سراز بان نہیں رکھتے تھے.. سب دیکھتے تھے لیکن کچھ نہیں کہتے تھے..“ وہ پھر اُمڈ نے لگی..

”نہیں...“ اُس نے اپنے آپ کو پھر الگ کیا ”مجھے.... یہ اچھا نہیں لگتا..“

”قادر جو کچھ دیکھتا ہے اُس کے مقابلے میں یہ تو بچوں کی چھیڑ چھاڑ ہے.. بابا سائیں کو اس نے کن حالتوں میں نہیں دیکھا.. یوکیٹا امیجن... باہر سے اندر کچھ دکھائی

”نہیں دیتا اور قادر یہاں نہیں ہے.. تم سمجھ لو کہ ہم ایک بند کمرے میں ہیں تنہا ہیں...“

”میں نہیں سمجھ سکتا..“

”لیکن میں تو سمجھ سکتی ہوں...“

فلینٹ فلی فر نشد تھا..

اس میں اس کے مکین کی سانسیں ابھی تک موجود تھیں اور یہ باقاعدہ ایک رہائش گاہ تھا.. یہ وہ آماجگاہ نہیں تھی جو بوقت ضروری کھلتی ہے اور وہ ضرورت پوری ہونے کے بعد پھر بند سکوت میں اتر جاتی ہے اور صرف ایک آرامدہ بستر اس کی آرائش کا اہم ترین جز ہوتا ہے..

یہاں جو کوئی بھی رہتا تھا ذوق رکھتا تھا..

کوئی بھی روشنی براہ راست نہیں تھی.. مدھم اور ملائم انداز میں تھی..

آرائش اگرچہ جدید رنگ میں تھی لیکن اس میں مشرق کا.. بلکہ سندھ کا ایک چہرہ کاؤ بھی تھا.. جیسے شیف کسی خاص ڈش کی ترکیب بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اب... اے ڈیش آف سویا ساس... ایسے اس فلیٹ کے مغربی ڈیکور میں.. اے ڈیش آف سندھ..

اور اس ڈیش میں سب سے بھاری اور نمایاں پلنگ تھا.. چوڑا، موٹے اور پستہ قد فیل پایوں پر براجمان پلنگ فرش سے دو بالشت بھی اونچا نہ ہو گا.. اس پر پچھی زلی کے ہر پوند میں کہیں گول کہیں چوکور، شیشے بڑی نفاست سے ٹانگے گئے تھے... پلنگ کے سرہانے میں سے ایک چوبلی مور کی شکل ابھری ہوئی تھی جو کسی دیہاتی کاریگر نے تراشی تھی... اس میں نفاست تو نہیں تھی ایک خاص قسم کا کھر دراپن تھا اور یہی اس کی خوبی تھی.. مور کی اس شکل میں صرف مور نہ تھا بلکہ تراشنے والے کی قوت و اہمہ بھی شامل تھی.. جس نے اسے انوکھی وضع دے دی تھی.. یہ پرندہ جو مور سے مشابہ تھا پر سمیٹے ہوئے تھا اور اس کی لمبی گردن کے نیچے جو بدن تھا اس پر کسی ماہر آرائش نے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے پرانے فریم جڑے ہوئے تھے جن میں مختلف صورتوں اور شکلوں کے آئینے تھے.. ان میں ہر آئینہ دھندلایا ہوا اور بجھا ہوا تھا اور اپنی قدامت کے برسوں کی گواہی دیتا تھا.. جسامت میں الگ الگ.. کل سات آئینے تھے.. ہر آئینے کے گرد جو چوکھٹا تھا اس کی نقاشی الگ تھی، قدامت میں فرق تھا.. کسی پر نیل بونے کھدے تھے اور کسی پر صرف لاکھ کے گھوڑے رنگ تھے.. اگرچہ پرانے ہونے

کے باعث نیم سیاہ ہو رہے تھے... وہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ سندھ کے صحرائی خطوں کے دور افتادہ دیہات کے کچے کوٹھوں، گوبوں اور جھونپڑیوں میں سے آئے ہیں.. ان میں سینکڑوں چہرے جذب تھے جو انہیں دیکھتے تھے اور اپنے رُوپ پر ناز کرتے تھے.. اور جب یہ ان کے لئے کسی کام کے نہ رہے.. ماند پڑ گئے، دھندلا کر اندھے ہونے کو آئے تو انہیں بڑے شہر سے آیا ہوا کوئی بیوپاری نئے چمکیلے پلاسٹک کے فریموں میں جڑے ہوئے آئینوں کے بدلے میں لے گیا..

پلنگ کے دائیں جانب جہاں داخلے کا دروازہ تھا اس کے برابر میں ایک قدیم وضع کا سندھی جھولا پڑا تھا.. اور اس پر بھی لاکھ کے کام کی نہایت بُر آرائش اور رنگین نقاشی تھی.. پلنگ کی پانکتی کے سامنے کی پوری دیوار شیشے کی تھی..

پردے سمیٹ دیئے گئے تھے..

سورج بند شیشوں کی بڑی کھڑکی کی سطح سے ابھی اوپر تھا پھر بھی اس کی تیز روشنی ایک خاص زاویے سے مور کے پردوں پر آویزاں ان سات آئینوں پر پڑتی تھی تو دھندلاہٹ کے باوجود وہ چمک سے دکنے لگتے تھے..

کھڑکی کے نیچے قطار اندر قطار پستہ قد عمارتیں تھیں جو صرف جھانکنے سے نظر آتی تھیں ورنہ ان کے پار جو سمندر وسیع ہوتا تھا وہ پلنگ پر بیٹھنے سے کھڑکی میں سے اُمتا تا اندر آتا محسوس ہوتا تھا..

پاگل خانے کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ وہ اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر لے اور جب جی چاہے اس کا قفل کھول کر اسے دیکھ لے..

یہ دہلی پتلی دیتا می پکی بھی کسی ایسی ہی خواہش کی اسیر تھی.. وہ بھی اسے اس فلیٹ میں بند کر کے جا چکی تھی..

نسان پٹرول جب اس رہائشی کا مپلیکس کی ایک عمارت کے قریب آکر رُک گئی تھی تو عابدہ نے یکدم اپنے آپ کو اور اپنی مسکراہٹ اور لہاڑے کو سمیٹ کر نہایت نپے تلے انداز میں کہا تھا... تم قادر کے ہمراہ اوپر چلو... میں بعد میں آؤں گی.. ہمیں اکٹھے نہیں دیکھا جانا چاہئے..

گیارہویں منزل پر لفٹ سے باہر آکر.. ایک طویل اور بے آباد سی راہداری کے

آخر میں قادر نے اپنے اجرک کے نیچے کرتے کی گہری جیب میں سے ایک چابی نکال کر ایک فلیٹ کے دروازے کو کھولا تھا اور ایک گونگے خواجہ سرا کی طرح جھک کر ایک اشارے سے اُسے اندر جانے کو کہا تھا۔ اُس نے اُس کا ہیک اندر رکھا اور جب وہ پلنگ کے سرہانے میں سے ابھرے مور کے پروں پر آویزاں پرانے آئینوں کو دیکھ رہا تھا اُس کے کانوں میں دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔

وہ اپنے ذہن میں حساب لگا رہا کہ قادر اتنی دیر میں نیچے پہنچے گا۔ پھر عابدہ کو اوپر آتے ہوئے اتنا وقت لگے گا۔ اور وہ اس دوران فلیٹ کا جائزہ لیتا رہا۔ لیکن جب اتنی دیر سے کہیں زیادہ دیر ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو اُس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ اُسے دھکیلا۔ بار بار ہینڈل گھمایا۔ قادر اُسے مقفل کر کے چاچکا تھا۔ پہلے تو شدید جھنجھلاہٹ اور کسی حد تک طیش میں آکر اُس نے دروازے پر زور زور سے دستک دی۔ باہر نکلنے کے لئے کسی اور دروازے کی بے سود کوشش کی اور پھر تھک ہار کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے جان بوجھ کر مقفل کر دیا گیا ہے۔ کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی۔ کوئی مسئلہ ہوگا۔ اور بالآخر اس کی کوئی سادہ اور قابل فہم توجیہ ہوگی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ... تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ اُس کا غصہ اور طیش بے بسی اور جھلاہٹ میں بدلنے لگے۔ یہ اُس کا اپنا کیا دھرا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس قسم کی مخدوش خواتین سے سداہ و رسم بڑھانے کی... اپنی مردانہ انا کی تقضی کے لئے صرف ایک ٹیلی فون کال پر ملاقات کے لئے مان جانے کی... زوال کے ان برسوں میں اس قسم کے تجربے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پلنگ کے سرہانے پر آویزاں سات آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تو اُس کا چہرہ مزید دھندلا جاتا۔ بہت ہی مضحکہ خیز دکھائی دیتا اور عجیب سے ڈر اُس مقفل بے چارگی میں اُس کے ذہن میں ابھرتے... ہو سکتا ہے وہ اپنی متوقع موت کی دہشت میں آکر ایک سیریل کلر میں بدل گئی ہو... دوسروں کو بھی زندہ نہ دیکھنا چاہتی ہو... یہ اُس کا طریقہ وار دات ہو... اپنی گہری جنسی آواز کے گرداب میں گھیر کر انہیں اس فلیٹ میں لے آتی ہو... خاور کو یہ سب کچھ ممکن لگ رہا تھا اور اُس نے پلنگ سے اٹھ کر باتھ روم کا دروازہ کھول کر یہ تسلی کی کہ کہیں اُس میں تیزاب کا کوئی ڈرم تو نہیں جس میں وہ لاشوں کو گھلاتی ہے... وارڈروب کے اندر بھی جھانکا۔ وہاں نسوانی لباس اور زیر جامہ ملبوسات کے ڈھیر تھے۔ اُن کے عقب میں کوئی بے جان بدن نہ تھا۔

جھلاہٹ اور بے بسی نے اُسے ناتواں کر دیا اور وہ ایک غصیلے بلکہ مقدس صبر کے ساتھ قناعت کر کے لمبوں پر بیٹھ گیا۔ لمبوں لادھیرے دھیرے لمبوں لئے لگا۔ چار بجنے کو تھے۔ فرم کا جو بھی ڈرائیور اُسے ایئر پورٹ پر لینے آیا ہوگا اُس نے واپس جا کر رپورٹ کی ہوگی کہ وہ اُس فلائٹ پر نہیں آیا تھا۔ اور میننگ اُس کے بغیر شروع ہو گئی ہوگی۔ سورج ذرا نیچے آیا اور کھڑکی کے کنارے پر اُنک کر پورے فلیٹ میں جھانکتا ہوا اُسے چکا چوند کرنے لگا۔

انڈس کوئین کے عرشے پر کوئی گہما گہمی نہ تھی۔
روشنی نہ تھی۔

وہ سندھ کے پانیوں پر رات کی اتھاہ تاریکی میں ایسے سوگواری سے تیرتی تھی جیسے وینس کے کسی خصوصی گنڈولے میں کوئی تابوت سیاہ ساٹن میں لپٹا ہو اور وہ بے رونق ماتمی آہستگی سے پانیوں پر سرکنا قبرستان کو جاتا ہو۔
عرشے کے درمیان میں ایک مردہ بدن پڑا تھا جس پر دھبے تھے کھرینڈ تھے۔

سورج کھڑکی کے بالائی فریم سے اُترتا فلیٹ میں چند ہیادینے والی روشنی بھرتا۔ ایک طویل مدت تک اُس کا یہ نامعلوم آہستگی کا اُترنا جاری رہا اور بالآخر وہ نیچے ہو کر نچلے فریم کھڑکی کی چوکھٹ تک آگیا۔ اور جب اُس کی گولائی کا کچھ حصہ اوچھل ہوا اور اُس کی لشک قدرے مدھم ہونے لگی اور ساتوں آئینوں میں بھی مختلف زاویوں سے مدھم ہونے لگی تو فلیٹ کا دروازہ کھلا اور وہ اندر آگئی۔

ایک زرد بجھتے ہوئے زرد رنگ کی ساڑھی میں لپٹی جو اُس کے چہرے پر کھنڈتی پیلاہٹ سے میچ کرتی تھی وہ اندر آگئی۔ اپنی بیماری اور زردی میں شاندار لگتی ہوئی... نہ وہ ہنسی نہ اُسے دیکھ کر ایئر پورٹ کی طرح روشن ہوئی اور نہ ہی اُس نے کوئی دلیل پیش کی اُسے یوں قید کر کے چلے جانے کی۔ اور نہ کوئی معذرت کی۔ اُس کا چہرہ کور اور بے جان سا تھا۔ وہ روایتی ترکیب کے مطابق خوش شکل نہ تھی۔ لیکن اب نفاست سے بندھی ہوئی زرد رنگت کی ساڑھی میں اُس کا بدن ایک ناتواں مگر نوخیز بوئے کی طرح نکلتا تھا۔ اور

یہ بونا کھڑکی کی چوکھٹ پر اترے ہوئے سورج کی ڈھلتی کرنوں میں سرسوں کے ایک کھیت کی زردی میں ڈھلتا تھا... وہ اس پیراہن میں بے حد رائل لگ رہی تھی جیسے جلتے ہوئے ٹرائے کے ماتم میں کھڑی ایک شہزادی ہو...

وہ کچھ دیر بنا کچھ کہے کوری اور بے تاثر اس کے سامنے کھڑی رہی اور پھر اپنا لامبا بازو اٹھا کر ساڑھی کے پلو کو کاندھے سے گرایا اور اس کی گرہیں کھولنے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں.. آرام کرنا چاہتی ہوں"

زرد ساڑھی کو بڑے اہتمام سے لپیٹ کر جیسے اس کے پاس صرف یہی لباس ہو اس نے جھولے کی نشست پر رکھ دیا اور پلنگ پر پچھی زلی کی چادر کا ایک کونہ اٹھا کر اس کے اندر سرک گئی.. اس کے زیر جامہ ملبوسات بھی زرد رنگ کے تھے اور جسم کی زردی سے الگ نہ ہوتے تھے.. اور جب وہ اپنے آپ کو چادر کے اندر سرکار ہی تھی تو اس کے بدن پر جودھے اور کھرینڈ تھے وہ زردی سے الگ ہو کر نمایاں ہو رہے تھے اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی..

خاور نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا کہ اگر وہ آگنی تو میں کن لفظوں میں اُسے بے عزت کروں گا چیخوں گا... اور پھر اپنا بیک اٹھا کر اس رابطے سے اور اس فلیٹ سے ہمیشہ کے لئے نکل جاؤں گا لیکن وہ گنگ ہو گیا.. خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا... اُسے ناپسند کرنے کی کوشش کرتا رہا.. اگر تو وہ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی "آئی ایم سوری" یا کوئی اور معذرت کرتی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ یقیناً اُسے پرے دھکیل کر شاید اُس پر ہاتھ اٹھا کر پھٹ پڑتا... لیکن اس کے چہرے کی آزر دگی اور تحنن نے وہ تمام لفظ گنوا دیئے... جیسے آپ نیند میں چلنے والے ایک شخص سے ناراض نہیں ہو سکتے اُسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے اگر ایسا کریں گے تو خود ہی مجرم محسوس کریں گے.. خاور نے صرف ان کے درمیان آئی ہوئی خاموشی کو توڑنے کے لئے بغیر کسی شکایت یا رنجش کے کہا "تمہیں یہ تو معلوم تھا کہ مجھے آج چار بجے کسی شوق کی خاطر نہیں اپنی روزی کے حصول کے لئے ایڈورٹائزنگ فرم کی میٹنگ میں پہنچنا تھا.. میں ان کے خرچ پر یہاں آیا ہوں.. ان کے لئے آیا ہوں"

"پلیز میرا ہینڈ بیک مجھے دے دو"

مرا کو لیڈر کا فیشن کردہ ہینڈ بیک لٹچولے کی نشست پر تہہ شدہ ساڑھی کے برابر

میں پڑا تھا..

خاور نے خاموشی سے تعمیل کر دی..

وہ کہنیوں کے بل اٹھی.. اس کے بازو بہت ناتواں تھے.. انگلیاں لامبی اور کمزور تھیں جن سے اس نے ہینڈ بیک کی زپ کھولی اور اس میں سے کرنسی نوٹس کا ایک نیا اور کورا پلندہ نکالا "تمہیں وہاں سے کتنی روزی ملے گی؟... اتنی تو اگلے پانچ برس میں بھی نہیں ملے گی... یہ تم رکھ لو... میرے لئے یہ بیکار ہیں.. لیکن پلیز میرے پاس رہ جاؤ.. آئی بیک یو.."

کچھ دیر لرزتی انگلیوں سے اس نے نوٹوں کے پلندے کو تھامے رکھا.. اور پھر اُسے بے دلی سے ایک جانب پھینک کر زلی کی چادر کے اندر ہو گئی اور اس میں منہ چھپا کر رونے لگی.. وہ کھڑکی کی جانب پشت کئے کھڑا تھا اور اس کے سامنے پستہ قد پلنگ پر پچھی زلی کے اندر اس کا بدن سسکیوں سے لرزتا تھا.. کبھی بالکل ساکت ہو جاتا تھا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کپکپانے لگتا تھا.. رونے کی آواز نہیں آتی تھی..

سورج کھڑکی کی چوکھٹ پر ابھی تک انکا ہوا تھا اور اس کی چمک پہلے سے ماند ہوتے ساتوں آئینوں میں مزید بجھتی تھی.. خاور اس کے سر ہانے بیٹھ گیا اور زلی کی چادر کو آہستہ آہستہ تھکنے لگا.. "پلیز تم روؤ نہیں.."

بہت دیر تک اُسے ایک بچے کی طرح... جیسے اُسے سلانے کی کوشش میں ہو تھکتا رہا.. اس کی ہر سسکی زلی کی چادر میں سے سرایت کرتی اس کی انگلیوں میں اترتی اور پھر اس کے پورے بدن میں پھیل جاتی..

اس کی سسکیاں کم ہونے لگیں.. اور پھر زلی کے اندر سے اس کی ایک عجیب مٹی ہوئی لاچار آواز آئی "میرے بیک کو کھول کر دیکھو کہ اس کے اندر کیا ہے.."

"تم خود کیوں نہیں اٹھتیں.. میں کہیں نہیں جا رہا.."

"نہیں.. میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتی.. چادر میں سے اس کی بے چارگی میں ڈوبتی آواز آئی "تم میرے بیک کو کھول کر دیکھو"

خاور نے سائنڈ ٹیبل پر دھرے بیک کو اٹھا کر اس کی زپ کھولی.. کچھ رقم تھی.. کریڈٹ کارڈز... سٹورز کے بل.. میک اپ کا کچھ سامان.. کچھ سادہ کاغذ اور ایک بال پوائنٹ.. اور کچھ رپورٹیں تھیں نسخے تھے... پاگل خانے کے بیک کی تلاشی لینے کے دوران

جس قسم کے کاغذات برآمد ہوئے تھے ان کی نوعیت بھی اُن سے ملتی جلتی تھی.. ان پر لنڈن اور کراچی کے معروف ہسپتالوں کے نام تھے..

”کیا تم دیکھ رہے ہو؟“ اُس نے چادر کے اندر سے پوچھا..
”ہاں...“

”یہ میری فائل رپورٹس ہیں خاور... پچھلے ہفتے ایک مرتبہ پھر.. شاید ہزارویں مرتبہ پھر میرے تفصیلی ٹیسٹ ہوئے.. میں تین روز کے لئے انگلینڈ گئی تھی ڈاکٹر اینڈریو کے بلانے پر... اُنہوں نے میرے بدن کے ہر حصے سے کچھ نہ کچھ کاٹا.. میرا آدھا خون نکال لیا.. اور پھر یہ رپورٹس دیں.. کیا تم انہیں دیکھ رہے ہو؟“

رپورٹس بہت طویل اور تفصیلی تھیں اور جو کچھ اُن پر درج تھا وہ زبان اُس کی فہم سے بالاتر تھی.. طبی محاورے، نامانوس لفظ اور ہند سے تھے..
”میں انہیں نہیں سمجھ سکتا..“

عابدہ سومرونے زلی کو نیچے کیا اور اُس کا آنسوؤں سے ترزد چہرہ خاور کے سامنے آگیا جس کے عقب میں پٹنگ کے سرہانے پر تراشیدہ مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں ڈھلتے سورج کی کرنیں بچھ رہی تھیں ”مجھے صرف دس دن دیئے گئے ہیں.. صرف دس دن.. زیادہ سے زیادہ“

وہ سکتے میں آگیا.. سمجھ تو گیا لیکن اس کے باوجود اُس نے کہا ”میں سمجھ نہیں سکا“
”میں مر جاؤں گی دس دن کے اندر اندر... ایز سہیل ایز دیٹ... اور تم اپنی چار بچے کی میننگ کے بارے میں فکر مند ہو..“
”نہیں.. یہ.. یہ کیسے ہو سکتا ہے..“

”اگر کوئی شخص دس دن کے اندر اندر نہ مر رہا ہو تو وہ کہے گا کہ میں مر رہا ہوں.. موت میں مزاح کی گنجائش تو نہیں ہوتی خاور ڈارلنگ...“ اُس نے آنسو پونچھے اور بے اختیار ہنسنے لگی.. ہنستی گئی.. اور وہ اُسے دیکھتا رہا.. اُس کی ہنسی میں ہسٹریائی عنصر قطعی شامل نہ تھا وہ بے بسی اور اختتام کے آگے ہتھیار ڈال دینے والے ایک لاچار شخص کی ہنسی تھی..

”میں تمہارے پاس ٹھہروں گا عابدہ.. جب تک کہ تم کہو.. لیکن مجھے یقین ہے کہ

ایسا نہیں ہوگا.. کیونکہ دنیا میں کوئی شے بھی حتمی اور یقینی نہیں ہوتی..“

”میرے پاس آ جاؤ..“ اُس نے زلی کا کونہ اٹھایا اور سمٹ کر پرے ہو گئی ”آئی ایم سوری کہ میں تمہیں لاک کر کے چلی گئی تھی.. میں تم سے ٹھہرنے کو نہیں کہہ سکتی تھی کہ تم نہیں ٹھہرتے اور اپنی میننگ اینڈ کرنے کے لئے چلے جاتے.. لیکن میں نے گھر واپس جا کر پھر سے باہر نکلنے کا کوئی بہانہ بنانا تھا.. یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں کہاں جاتی ہوں اور کیوں جاتی ہوں لیکن محض ریکارڈ کی خاطر مجھے گھر واپس جانا تھا.. خدا بخش اگلے الیکشن کے لئے جوڑ توڑ کر رہا ہے.. بابا سائیں اپنی پارٹی بدلنے کے لئے تنگ و دو کر رہے ہیں اور وہ میرے ہونے یا نہ ہونے سے آگاہ نہیں ہوتے.. صرف میری بیٹی ہے.. اور وہ بھی کیوٹ تھنک یہ نہیں جانتی کہ اُس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے... وہ اپنے کارٹون دیکھتی ہے اپنی گیمز کھیلتی ہے... صرف تم ہو خاور جس سے میں بات کر سکتی ہوں اور کوئی نہیں..“
”تم نے خدا بخش کو بتایا ہے.. ان فائل رپورٹس کے بارے میں..“

”ہاں بتایا ہے.. لیکن وہ ایک پیدائشی سیاستدان کی مانند بہت مینھا اور بہت تسلی دینے والا شخص ہے.. میری ڈھارس بندھاتا ہے کہ نہیں عابدہ یہ رپورٹس غلط ہیں.. ان ڈاکٹروں کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ تو اپنی فیسوں کے لالچ میں مریضوں کو خوفزدہ کرتے ہیں.. ڈاکٹر اینڈریو چونکہ تم پر مرنا ہے اس لئے وہ تمہیں اپنے قریب رکھنا چاہتا ہے.. تم بالکل فکر نہ کرو تمہیں کچھ نہیں ہوگا.. اور خاور.. اُس لمحے میں اُس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی ہوں کہ اگر اُس کے کسی پسندیدہ اور لاڈلے کتے کے بارے میں وینٹری ڈاکٹر یہ رپورٹ دے کہ وہ اگلے دس دن میں مر جائے گا تو وہ... اتنا رنجیدہ بھی نہیں ہوتا.. یہ میں دیکھ سکتی ہوں... اور اُنہی آنکھوں میں میں اُس لڑکی کو بھی دیکھتی ہوں جو میرے بعد فوراً میری جگہ کو پر کر دے گی...“ عابدہ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپتی زلی کی چادر سے الگ کر دیا اور وہ انڈس کوئین کے ویران عرشے پر پڑی برہنہ دیت نامی بچی تھی ”میری تمنا تھی کہ میری سوئی بیٹی کے بعد تم سے مجھے ایک بیٹا ملے اور میں اُس کا نام یاد رکھوں.. لیکن دس روز کے اندر اندر تو یہ ممکن نہیں ہوگا..“ وہ پھر سے ہنسنے لگی.. اور اس ہنسی میں کوئی بے چارگی یا مرگ کا خوف نہ تھا بلکہ ایک پیہاک اور آزاد اظہار کی ہنسی تھی... ”میں تمہیں ایک نظم سناؤں..“ وہ ہنستے ہنستے ختم گئی..

”نظم...؟“

”ہاں... یا جو کچھ بھی میں کہنا چاہتی ہوں... تم سے... اپنے آپ سے... سناؤں؟“

”ہاں...“

اُس نے ہینڈ بیگ کو پلنگ پر الٹ کر... میک اپ کے سامان... کریڈٹ کارڈز اور رپورٹس میں سے ایک کا غڈ تلاش کیا اور آنکھیں پونچھ کر اُسے پڑھنے لگی... جیسے درخواست پیش کر رہی ہو... ایک رپورٹ دے رہی ہو...

میں نے سنا ہے..

برگزیدہ ہستیوں سے میں نے سنا ہے کہ..

خدا کے نیک بندوں کے بدن کو مٹی نہیں کھاتی..

مٹی کو منائی ہے کہ وہ اُن کو مٹی کر دے..

پر میں تو نیک بندوں میں شامل نہیں ہوں..

میں تو گناہوں اور خواہشوں کے گرداب میں گھومتی ہوں..

تو مٹی میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی..

مجھے کھا جائے گی..

ملیا میٹ کر دے گی..

اپنے ساتھ مٹی کر لے گی..

تو اُسے کیا ملے گا؟.. کچھ بھی نہیں.. نا آسودگی اور پیاس کے سوا کچھ بھی نہیں!

مٹی کے بوجھ تلے..

کیزوں کو اپنے مردہ بدن پر ریختے ہوئے..

میں صرف یہ کہوں گی.. ٹھہرو...

قربت مرگ میں مجھے محبت ملی تھی..

میری تمام تر آلائشوں اور ناپاکیوں کے باوجود مجھے ملی تھی..

اور اُس نے مجھے پوتر کر دیا ہے..

تم.. اے مٹی.. مجھے ریزہ ریزہ کر کے اپنے آپ میں شامل کر لو تو بھی..

میں فنا نہیں ہو سکتی..

کیونکہ اس محبت نے مجھے برگزیدہ کر دیا ہے..

میں ڈوبتے سورج کے زرد تھال کو دیکھتی اور اُسے بیان کرتی تھی..

اور وہ میرے چہرے پر جھکا تھا مجھے سنتا تھا..

اور میں کھلی آنکھوں سے اُس کے بدن کے پار.. پرے..

کھڑکی کی چوکھٹ پر اُنکے سورج کو بیان کرتی تھی..

یہ میرے آخری لمحے تھے..

آخری سانس تھے..

تو اے مٹی... تو مجھے ملیا میٹ نہیں کر سکتی..

مجھے اپنے آپ میں مٹی نہیں کر سکتی..

تو مجھے کھا نہیں سکتی.. فنا نہیں کر سکتی..

اس لئے کہ..

میں بھی نیک بندوں میں سے ہوں..

برگزیدہ ہوں..

پلنگ کے ساتوں دھندلاتے ہوئے آئینوں میں کھڑکی کی چوکھٹ پر اُنکے سورج

کی ٹھنڈی ہوتی گول پرات تھی..

وہ اُس کے چہرے پر جھکا تھا اور اُس کی مرگ پیلاہٹ میں پیلا ہوتا تھا اور اپنی پشت پر

پلنگ کی پائنتی کے پیچھے کھڑکی کی چوکھٹ پر اُنکا جو زرد غروب کا سورج تھا اُسے نہ دیکھ سکتا تھا

لیکن وہ اُسے بیان کر رہی تھی.. ”دیکھو خاور.. میں تمہیں دکھاتی ہوں اور تم مجھ پر جھکے مجھے دیکھتے

رہو اور میں تمہیں دکھاتی ہوں کہ اس لمحے زرد تھال کے سامنے سے سمندری بگلوں کی ایک ڈار

گزر رہی ہے.. اور ہر بگلے کا ایک ایک پر جو اُڑان میں ہے الگ الگ دکھائی دے رہا ہے.. وہ اگرچہ

سفید ہیں لیکن اس لمحے زرد ہیں جیسے سرسوں کے کھیت میں سے نہا کر نکلے ہوں... سورج اب

ایک ٹھنڈے ہوتے پگھلاؤ میں نیچے ہو رہا ہے.. میری آنکھوں میں وہ سورج ہے.. زرد سمندری

پرندوں کی ڈاریں ہیں.. اور دیکھو وہ ڈاریں گزر گئی ہیں اور سنہری تھال پھر سے ویران ہو گیا

ہے... لیکن ابھی ابھی ایک اور پیچھے رہ جانے والا پرندہ اُس کی زردی میں داخل ہوا ہے اور نکل گیا

ہے.. تھال پھر سے ویران ہو گیا ہے لیکن میں ویران نہیں ہوئی بھری ہوئی ہوں..“

ایس عشقے دی جھنگی وچ مور بولیندا...
 اُس پلنگ کے سرہانے بھی ایک مور بولا تھا...
 ساتوں آئینوں نے الگ الگ کلام کیا تھا...
 ہر آئینے میں جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی... اور ہر تصویر جدا تھی اور اُس میں
 ہولے ہولے جان پڑتی تھی... غروب کا سورج بدنی زاویوں سے کچھ زاویے نمایاں کرتا تھا...
 سات آئینوں میں سات متحرک سچ تھے...

کشتی ہولے ہولے ڈولتی ڈھلتی دوپہر کے سورج کی آخری تمازت میں کنارے
 کی گیلی ریت کو کندھے مارتی تھی... اگر یہاں بھی ایک کھڑکی ہوتی تو وہ اس سے اس کی چوکھٹ
 پر اٹکا ہوتا... وہر کے ہوئے تھے...
 جہاں کشتی اپنے کھونٹے سے بندھی پانی میں بے چین ہوتی کناروں سے سر ٹکراتی
 تھی وہاں سے کچھ دوری پر سرور گھنٹوں تک آئے پانیوں میں لنگوٹ باندھے جھکا... جھکا پانی
 کے اندر بہت دھیرے دھیرے دونوں ہاتھ حرکت میں لاتا تھا... جیسے ناپینا چانتا ہو کہ راستے
 میں ٹھوکر کھانے کے بہت سے اسباب بکھرے ہوئے ہیں اور وہ ہاتھ پھیلائے ان میں... اپنی
 انگلیوں میں پوری توجہ بھر کر آہستہ آہستہ ہوا کو ٹٹولتا ہوا چلتا ہے... یکدم سرور نے دونوں
 ہاتھ پانی میں سے یوں اچھال باہر کئے جیسے کسی شے نے اسے ڈس لیا ہو... سندھ کے گدلے
 چھینے اس کے بدن پر آگرے اور اس کے سیاہی کو مزید گہرا کرتے ناگوں پر لکیریں بناتے پھر
 سے دریا میں جذب ہو گئے "ادھر سے دھمی یا کھگا غیب ہے ماماں..." اس نے اپنا آپ پانی میں

چوٹی مور کے پروں میں آویزاں ساتوں آئینوں میں وہ اپنے آپ کو دیکھتا تھا...
 اُس کے کھلے منہ کے اوپر جو کھلی آنکھیں تھیں اُن میں اُس زرد تھال کو دیکھتا تھا جس کے اندر
 ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا تھا...
 سات آئینے تھے جن میں اُس کا زوال پذیر بدن دکھائی دیتا تھا...
 اُن سب میں سے ابھی ابھی ایک پرندہ اپنی سفیدی کھو کر زرد ہوا تھا اور پھر نکل گیا
 تھا...

قربت مرگ میں محبت گہرے بوجھل سانس لیتی تھی...
 ان سانسوں سے سائیڈ ٹیبل پر بکھری فائنل رپورٹس نم ہوتی تھیں...
 پلنگ کے سرہانے چوٹی مور کی چونچ کھل گئی... می آؤں... می آؤں...

وصل ہوئیاں میں نال بجن، شرم حیا نوں گوا کے
 وچ چن میں پلنگ وچھایا یار سُٹی گل لا کے

سے کھینچ کر باہر کیا اور جعفر کے پاس آگیا جو اپنے ٹکونے جال کو ریت پر ٹکائے اس کی ڈوریوں میں گانٹھیں دے رہا تھا۔ پچھلے ایک پہر سے تو ٹھنڈ کے مارے پانی میں کھڑا ٹھہرتا ہوں کہ کوئی کھگا ہاتھ سے لگ کر گزرے تو سہی تو میں اسے صاحب کے لئے باہر اچھال دوں پر ادھر تو قحط پڑ گیا ہے اماں۔ رب کا نام لے کر پانی میں اترتا تھا کہ مالکا کوئی دو چار دانے ٹھکوں کے رات کی ہانڈی کے لئے ہاتھ لگا دے۔ تو بھی کچھ ہاتھ میں نہیں آیا۔

ایک اور گرہ لگا کر اماں جعفر نے اسے تھوک لگا کر پکا اور پیڑا کیا اور بولا ”سرور۔۔۔ پچھلے کتنے روز سے رب کا نام لے کر پانی میں اترتا رہا ہے ناں تو کچھ ملا؟۔۔۔ وہ سن نہیں رہا۔ تو آج اس کا نام نہ لیتا تو شاید کچھ مل جاتا۔“

مونا شکاری عطاء اللہ کسی خاص منصوبے کے تحت ان کے برابر چلتا آ رہا تھا۔ وہ کشتی میں چلتے تھے اور وہ کناروں پر جو دیہات، کھیت، نیلے اور جنگل ذخیرے سروٹوں اور کاہی کے تھے وہ ان میں سفر کرتا تھا۔ وہ کشتی میں کم ہی سوار ہوتا۔ پر انہیں نظر میں رکھتے ہوئے کناروں پر چلتا جاتا۔ ایک رات ان کے ہمراہ بسر کرنے کے بعد وہ پھر ان کے کیمپ میں سونے کے لئے نہیں آیا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز کہیں نہ کہیں اپنی توند پر کھسکتا تہبند ایک ہاتھ سے سنبھالتا اور دوسرے میں بندوق تھا سے وہ نظر آ جاتا۔ اس ڈھلتی دو پہر میں جب وہ سستانے کے لئے رکے تھے اور سرور کھٹکے پکڑنے کے لئے پانی میں اترتا تھا اور اماں اپنا ٹکونا جال مرمت کرتا تھا عطاء اللہ پھر نمودار ہو گیا تھا۔

”سائیں سرخابوں کے ایک ٹھنڈ کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہوں۔ ان ٹیلوں کی اوٹ میں اترے ہیں۔ سائیں شغل کرنا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔ ہاں سائیں آ جاؤ اور بیٹھے بیٹھے کیا کرتے ہو۔ پر ساتھ آنا ہے تو صبر کے ساتھ ایسے آؤ کہ پاؤں کے نیچے کی ریت بھی نہ کھسکے۔ سرخاب ذرا سی آہٹ پر۔۔۔ ریت کے ایک ذرے کے کھسکنے سے پر کھول دیتا ہے اور اڑ جاتا ہے۔ شغل کرو سائیں۔“

”تمہاری مہربانی۔۔۔“ ڈوری سے بندھی جل مرفی ابھی تک اس کے سامنے پھڑ پھڑاتی پانی پر تیرتی اپنے تئیں غائب ہونے کے لئے ڈبکیاں لگاتی۔ آپو آپ کنارے کی جانب کھینچتی چلی جاتی اور عطاء اللہ شغل کرتا۔ خاور کو اب بھی اس کے ہاتھوں میں وہی ڈوری دکھائی دیتی تھی۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اپنی ناپسندیدگی کو نفرت سے عیاں بھی

نہیں کرتا تھا۔ ”نہیں عطاء اللہ آپ شغل کرو۔“

وہ اپنا تہبند سنبھالتا۔ جھکا جھکا ریت کے ان ابھاروں کی جانب بڑھنے لگا جن کے عقب میں بقول اس کے سرخابوں کا ایک ٹھنڈ اترتا تھا۔

پہاڑوں اور پانیوں کا سفر دنوں کا حساب کتاب بھلا دیتا ہے۔ راتیں کتنی گزر چکی تھیں یہ بھی کچھ یاد نہ تھا۔ شاید تین یا تیس کچھ واضح نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ۔۔۔ کشتی چلتی جاتی تھی کنارے پیچھے رہتے جاتے تھے۔ بہاؤ بہتے ہوئے مسلسل سنائی دیتے تھے۔ کبھی دھوپ ہوتی تھی اور کبھی چھاؤں اور رات ہوتی تو لاوا جلتا تھا اس کے سوا کچھ اور واضح نہ تھا۔

ریت پر بیٹھا۔ اس کی تپش کو اپنے بدن کے اندر سرائت کرتے محسوس کرتا۔ خاور۔۔۔ فہیم کی تیار کردہ دھواں لگی چائے کے گھونٹ بھرتا تھا۔ اس کے سامنے ریت کنواری اور سپاٹ تھی تھوڑی دیر پہلے تک۔ اور اب اس پر عطاء اللہ کے بھاری قدموں کے نشان تھے جو ٹیلوں پر بلند ہوتے دکھائی دیتے تھے۔

کشتی کے اندر اس کے سلیپنگ بیگ پر بے پروائی سے لیٹی ناٹکیں پھیلائے پکھتی اپنا جھگاٹھائے بچے کے منہ کے قریب اپنی چھاتی کرتی تھی اور بظاہر لا پرواہ تھی لیکن اس کی سیاہ آنکھوں میں نا آسودگی کی جو شکایت تھی وہ خاور تک۔ اس کی چائے کی پیالی تک پہنچ کر اس کے لب جلاتی تھی۔

”کھگالے گا سرور۔۔۔“ اماں جعفر جال کی مرمت سے فارغ ہو کر اٹھا اور اپنے

کولہوں سے ریت جھاڑتے ہوئے کہنے لگا ”بس رب کا نام نہ لینا۔۔۔ وہ آج نہیں سن رہا۔“

جعفر اپنی دھوٹی ناٹکوں کے درمیان اڑس کر پانی میں اتر گیا اور جھک کر دونوں ہاتھوں سے سرور کی مانند پانی کو ٹٹولنے لگا۔ وہ نیچے نہیں دیکھتا تھا بلکہ نظر سامنے رکھتا تھا اور ہاتھ چلائے جاتا تھا۔ وہ دیکھتا دریا پار کے سرکنڈوں کو تھا مگر اس کے ہاتھ پانی کے اندر ہی اندر چلتے جاتے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کے چہرے پر مچھلی کے شوق کی بجائے فکر مندی کی سیاہی پھیلنے لگی۔ وہ جھکا ہوا تھا تو سیدھا ہو گیا اور پھر اپنی ناٹکوں کو غور سے دیکھا۔ ان تک آئے پانی کی سطح کو دیکھتا رہا جو گھٹنوں سے ذرا نیچے تھے اور صرف سرور کو مخاطب کیا۔ ”نہ ہونے والی بات لگتی ہے پر ہے۔“

”کیا اماں۔۔۔“ سرور خوش تھا کہ اماں کے ہاتھ بھی کچھ نہیں لگ رہا۔

”سندھ کے پانی کم ہو رہے ہیں سرور...“

”اس رُت میں تو پانی کم ہوتا ہے ناں ماماں... ساڈن تھوڑا ہے کہ شوکتا ہے اور

اونچا ہوتا ہے۔“

”تم مجھے سبق پڑھاتے ہو پانیوں کا...“ ماماں جیسے طیش میں آگیا ہو۔ ”میں نہیں

جانتا کہ اس رُت میں پانی تھوڑا ہو جاتا ہے اور کتنا تھوڑا ہوتا ہے اور کس کس جنگل نیلے میں کتنا

کم ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا...“

”معاف کر دو ماماں... میں نے تو یونہی بات کر دی تھی...“ سرور نے ہاتھ جوڑ کر

شرمندگی سے کہا۔

”ادھر جہاں میں کھڑا ہوں اس رُت میں... اس جگہ پر میں ہمیشہ کھڑا ہوتا ہوں

مچھلی کے شوق میں... جب میں نیانا تھا تو اپنے بڑے کے ساتھ ادھر آتا تھا تو ادھر پانی اتنا اونچا

رہتا تھا کہ میرے بڑے کے گھٹنوں تک آتا تھا... پھر میں بڑا ہوا تو میرے گھٹنوں تک آتا تھا

ہمیشہ... پچھلے برس اس رُت میں انہی دنوں میں... یہ میرے گھٹنوں کو چھوتا تھا پر اب کی بار

عجیب بات ہے کہ بہت نیچے ہے...“

”ادھر پہاڑوں میں کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہوگی... مینہ پانی کم برسا ہو گا۔“

”نہیں سرور... مجھے لگتا ہے کہ سندھ سوکھ رہا ہے...“

”ماماں بوٹی نے کام دکھایا ہے۔“ سرور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا

”سندھ سائیں کیسے سوکھ سکتا ہے“

”تم مجھ سے دین ایمان کی سونہ لے لے... بنا شک بوٹی کا کچا دیکھ لے... جو میں نے

سویر سے ایک گھونٹ بھی ساوی کا پیا ہو۔“

”نہیں پیا تو اب ڈیک لگا لے... سندھ میں پانیوں کی لہر بہہ ہو جائے گی...“ سرور

دانت لٹکانے لگا... ہنسنے لگا... پر جعفر کے سیاہ چہرے پر تشویش کی دھاریں کم نہ ہوتی تھیں...

دھوپ میں بہت حدت تھی اور وہ ریت کو ایسے جھلساتی تھی جیسے یہ چیترا کا مہینہ نہ ہو۔

ایک نیلے کے عقب میں سے مونا عطاء اللہ ابھر گیا... اس کا تہبند اس حد تک اس

کی توند سے ڈھلکا ہوا تھا کہ اس کے کچھ بال جو دکھائی نہیں دینے چاہیے تھے وہ بھی دکھائی

دے رہے تھے اور وہ ایک مست چال سے ریت میں سے پاؤں نکالتا ایک ہاتھ سے بندوق

سنہالتا چلا آ رہا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند تھا اور اس کی گرفت میں دو پنچے تھے جن

کے آخر میں قوس قزح کے سب رنگوں سے مزین ایک پرندہ جھولتا تھا...

”سائیں ریت میں دھنسن کر دم رو کے بیٹھا رہا پوری دو پہر... تو یہ ملا ہے۔“ اس

نے بازو مزید بلند کر کے پرندے کی نمائش کی ”سُرخاب ہے۔“

وہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا... اس کے خیر توں بھرے رنگ اسے مرنے نہیں

دیتے تھے...

سرور اور ماماں فوراً اس کے گرد ہو گئے۔ اس کے مونے بد وضع کندھوں کو تھپک

تھپک کر داد دینے لگے۔ جیسے وہ ایک مسرور ماہو جو میدان جنگ میں اپنے دشمن کو مار کر اٹھالایا ہو...

انہوں نے اس کی منٹھی میں بھینچے پنوں سے لٹکتے سُرخاب کی جانب ایک نظر بھی نہ کی...

”سور ماہی بہادری کے قصے بیان کرنے لگا...“ میں سویر سے ان کا پیچھا کر رہا تھا...

کبھی اس نا پو پر اترتے تھے اور کبھی دریا پار چلے جاتے تھے... پر میں نے پیچھا نہیں چھوڑا... پورا

نُجھنڈ تھا... ریت میں ریت ہو کر بُت بنا بیٹھا رہا۔ جب یہ چراگاہ میں چرتے تھے... اور جب

میں نے شست لگائی ہے سرور... لہلی دہائی ہے تو اس کے دہانے سے ان کو خبر ہو گئی اور یہ بجلی

کی طرح اڑان میں آگئے پر یہ والا کوئی بھولا پنچھی تھا پر کھول رہا تھا کہ چھروں کی زد میں

آگیا۔“

”واہ سائیں واہ“ وہ داد دیتے تھے...

”سرور ابھی اس کی کھال کھینچتے ہیں اور ہانڈی میں ڈال کر بھونٹتے ہیں اور صاحب کو

کھلاتے ہیں۔“ وہ اپنی ٹرائی بلند کیے اس کے پاس آگیا تاکہ اس سے بھی داد وصول کرے۔

”آپ کے لیے تھخہ ہے سائیں۔“

”نہیں...“

سرور کی رال مچکنے لگی۔ ”کیوں نہیں سائیں سُرخاب کوئی روز روز ملتا ہے... آپ

بے شک گوشت کھانا... ہم ہانڈی پونچھ لیں گے... یہ بڑا کمینہ پکھیرو ہے سائیں... نصیب

والے کے ہاتھ لگتا ہے...“

”ذرا اسے ہاتھ لگا کر دیکھو تو سہی سائیں...“ عطا اللہ سُرخاب اس کی آنکھوں کی

سطح پر لے آیا۔ ”ابھی گوشت گرم ہے اور دل دھڑکتا ہے۔“

اوپر آسمان ڈھلا ہوا اور بالکل خالی تھا...
اس میں اڑان کرنے والا ایک سرخاب کم ہو چکا تھا جو اب ریت کے ٹیلوں میں
روپوش ہو چکے عطاء اللہ کے ہاتھ میں لٹکتا تھا... اگرچہ مردہ تھا لیکن زندہ لگتا تھا کہ اس کے
رنگ اسے مرنے نہیں دیتے تھے...
اس خالی آسمان تلے پھیلے ہوئے سندھ کے پانیوں میں کشتی ہلکورے لیتی کنارے کی
ریت سے سر ٹکراتی تھی۔ آسمان صرف اس ایک سرخاب کی موت سے خالی ہو گیا تھا۔ وہ
اسے ایک گہرے رنج سے ٹکاتا جا رہا تھا...
وہاں کوئی پرندہ نہ تھا... اس کی نیلاہٹ کو اپنے پروں کی قینچی سے کاٹا کوئی پکھیر و
اڑتا نہ تھا۔

پر ایک پرندہ تھا...
اس کے بازو لکڑی کے تھے۔ وہ بے آواز نیلگوں آسمان پر تیرتا ایک ہموار رفتار
سے خاور کے اوپر سے گزرتا تھا۔ اس کے ماتھے پر لکڑی کے بھندے سے پکھے تھے جو بہت
آہستگی سے گھومتے جاتے تھے...
اوپر لکڑی کا ایک جہاز محو پرواز تھا۔
اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ پوجا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اپنی سفید پگڑی گھٹنوں کے
گرد باندھے سر جھکائے بیٹھے ہیں اور ان کی سفید لٹیں اسی آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے
ساتھ جہاز جا رہا تھا ہوا میں اٹھتی تھیں... ایک اور طوفان نوح کی آمد سے پیشتر وہ اپنے اللہ
لوک کے ہمراہ پرواز کرتے تھے۔

لکڑی کا جہاز سندھ کے اس ریتے ٹاپو کے عین اوپر سے گزرتا جاتا تھا جہاں لکڑی
کی کشتی کسی بھی طوفان سے بے خبر پانیوں میں ہلکورے لیتی کنارے کی ریت سے سر ٹکراتی
تھی... خاور کے سر پر سے گزرتا تھا اور پوجا میں اس میں سوار تھے۔

”تمہاری مہربانی ہے بھائی عطاء اللہ...“ خاور چائے کی پیالی ریت پر رکھ کر مشکل
سے اٹھا کہ اس کے گھٹنے اذیت دیتے تھے۔ ”آپ فہیم کے دوست ہو پر آپ ہمارا پیچھا نہ کرو...
تمہارا شکار مجھے گوارا نہیں۔ اسے تم ہمارے الاؤ پر نہیں بھون سکتے... تم سمجھتے ہو ناں... اسے
لے جاؤ... اور ہمارا پیچھا نہ کرو... تمہاری مہربانی ہے۔“

عطاء اللہ کے لشکتے دانت سیاہ ہونٹوں میں غروب ہو گئے اور اس کے چہرے پر
یکدم ایک ایسی ناگواری آئی جو صرف کھور لوگوں کے چہروں پر ہی آ سکتی ہے۔ ایک نفرت
سے بھری تھوکتی ہوئی ناگواری ”سائیں ہم تو باہر کے مہمان کی عزت کرنے والے لوگ
ہیں... آپ عزت نہیں کروانا چاہتے تو خیر ہے... ہم تو سائیں برمانی کے صدقے آپ کا خیال
رکھتے ہیں نہیں تو ہم بڑی حیثیت والوں کو بھی سلام تک نہیں کرتے...“ اس کا ہاتھ نیچے آگیا
اور سرخاب کی مردہ چونچ اس کے ڈھلکے ہوئے تہبند سے ٹکرانے لگی... اس کے پروں کے
رنگ عطاء اللہ کے بدرنگ تہبند پر بھی اثر کرنے لگے۔ ”سندھ کے ٹاپو اور پرندوں کی
چراگا ہیں تمہاری ملکیت میں تو نہیں ہیں سائیں کہ تمہاری اجازت کے بغیر ہم ادھر نہ آئیں
... ہم ادھر کے باسی ہیں جب جی چاہے گا آنکلیں گے اور جل مرغی اور سرخاب ماریں گے...
ویسے یہ جو کشتی کرائے پر لے کر ادھر آنے والے لوگ ہوتے ہیں ہم ان سے واقف ہیں...
دارو پیٹتے ہیں اور... پکھلی کو...“ اس نے زہر اگلا اور بدوق کو اور مردہ سرخاب کو ریت پر رکھ
کر اپنے ڈھلکے اور تقریباً گر جانے والے تہبند کو کھول کر پھر سے اپنی توند پر جمایا اور پھر بدوق
اٹھا کر... سرخاب کو جھلاتا ہوا ٹیلوں کی جانب چلا گیا...

سرور اور اماں سمجھ نہ سکے...
یہ سائیں کب ان کی سمجھ میں آتا تھا...
کتنے روز ہو گئے تھے سندھ کے ٹاپوؤں اور جزیروں میں رات کرتا... پکھلی پر نظر
نہ کرتا... یہ سائیں کب سمجھ میں آتا تھا۔

سرور چپکے سے کشتی کے اندر چلا گیا اور جعفر پھر سے جال میں گرہیں باندھنے میں
مگن ہو گیا... خاموش رہ کر انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔

دو پہر تو ڈھلتی تھی مگر سورج کی تمازت ریت کے ہر ذرے میں ابھی تک ٹھہری
ہوئی ہے الہتہ پانیوں پر سے آتی ہوا میں ٹھنڈک کے سائے محسوس ہونے لگے تھے۔

سانسیوں کی ہلچلی پر ٹھہرے تاریک آسمان میں یکدم کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

رسول پور کے گھنگھور سنائے پر ان کی گونج مدھم ہو کر جب کچے گھر وندوں کی بھس اور گارے سے تعمیر کردہ اُن موٹی دیواروں تک آئی جو گلیوں میں تھیں تو وہ اُن میں جذب ہو کر معدوم ہوتی گئیں۔ لیکن اس کے کانوں میں وہ سب کتے الگ الگ بھونکتے رہے۔ اس لیے کہ وہ رسول پور سے باہر بُوٹی سے ڈھکے جوہڑ کے کنارے کیکر کے جس سوکھے ہوئے ٹنڈ پر براجمان تھا وہ سانسوں کی ہلچلی کے قریب تھا۔ وہ الگ الگ بھونک رہے تھے اور چپ نہیں ہو رہے تھے۔ ان میں وہ بُوٹی بھی شامل تھا جس کی وجہ سے اسے شلوار ترک کر کے دھوٹی باندھنی پڑی تھی۔ وہ ایسا گنوار کتا تھا کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی شلوار نہیں دیکھی تھی اس لیے جب وہ رسول پور کی پہلی سویر میں کسی بھی گاؤں کی اپنی پہلی سویر میں ماسٹر رحمت علی کے کچے گھر میں سے نکل کر اپنا بستہ سنبھالتا بُوٹی سے بھرے جوہڑ کے کنارے اپنی کلف لگی شلوار کچڑ سے بچاتا سانسوں کی ہلچلی کے قریب پہنچا تھا تو کلف کی کھڑکھڑنے کتوں کے کان کھڑے کر دیئے اور وہ ان کھڑے کانوں کے ساتھ اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان کا سر غنہ یہی چٹکبرا بُوٹی تھا جو سب سے آگے آگے غراتا غضب ناک ہوتا اس کی شلوار کے پائینچوں کی جانب انتہائی رغبت سے بڑھ رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی اور جب وہ پریشان حال کچڑ میں لت پت ڈیرے پر پہنچا تھا تو چاچا ماسٹر نے کہا تھا "خاور پتر کل سے یہ پند گھنٹی پہن کر نہ آنا یہ شہریوں کا پہناوا ہے۔ اپنی چاچی سے کہنا وہ تمہیں میری کوئی پرانی دھوٹی دے دے گی۔ اسے پہن لینا۔ یہاں دیہات

میں کوئی شلوار پہن لے تو بڑی نموشی ہوتی ہے۔ کتے بھی اسے پسند نہیں کرتے۔" اور تب سے وہ ایک واہیات کپڑے کو کمر کے گرد لپیٹ کر اسے ازار بند سے باندھ کر قائم رکھتا تھا ورنہ اس کے بغیر وہ فوراً گر جاتی تھی اور پھر زیادہ نموشی۔ یعنی بے عزتی ہوتی تھی۔

یہ وہی چٹکبرا بُوٹی تھا جو سب سے بلند آواز میں بھونک رہا تھا۔ کتے کا بچہ! لیکن یہاں کیکر کے اس ٹنڈ کے اوپر بیٹھا وہ اس کی زد سے باہر تھا۔ چٹکبرے بُوٹی کے بھونکنے میں کوئی جان لیوا غراہٹ نہیں تھی۔ اس کے ہمنوا بھی صرف اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ بھونکنے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ اور یہ فرض وہ ہر جمعے کی رات کو باقاعدگی سے ادا کرتے تھے۔

آہستہ آہستہ ان کے بھونکنے میں وقفے آنے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ پوجا جی سانسوں کی ہلچلی سے باہر آگئے تھے۔ پرا بھی وہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ تاریکی اتنی گھنی تھی کہ وہ اگرچہ وہاں تھے لیکن دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس نے اپنا کان سانسوں کی ہلچلی کی جانب کیا اور بدن کو سننے کے لیے تیار کر لیا۔ کتے چپ ہو گئے اور سننا پھر سے اتر آیا۔ اس کیکر کے ٹنڈ پر وہ زیادہ گھٹا اور بھید بھرا تھا جس پر براجمان وہ پوجا جی کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ کان لگائے سنتا رہا۔ پوجا جی کی لرزتی آواز آتی تھی۔ اور وہ آنے لگی۔ اندھیرے میں سرایت کرتی اس سے لرزتی جھکڑی کہ میں نے تمہارے پار جانا ہے وہ آنے لگی۔ اس کی لرزش خاور کے کانوں تک پہنچنے لگی۔

بال چراغ عشق دا...
پو آجی ہمیشہ یہی چراغ روشن کرتے تھے۔
بال چراغ عشق دا میرا روشن کردے سیناں...
ان کے سینے پر بال نہیں تھے لیکن ماس کیا ملائم اور پسلیوں پر ریشم کی مانند کسا ہوا تھا...
دل دے دیوے دی روشنائی جاوے وچ زمیناں...

وہ جانتا تھا کہ جب یکدم پو آجی اپنی باریک اور لرزش میں سرسراہی آواز اونچی کرنے کی کوشش میں گھٹکھٹا جاتے تھے اور اول حمد شالہی جو مالک ہر ہر دا... گانے کی سعی کرتے تھے تو یہ وہی لمحہ ہوتا تھا جب وہ کیکر کے اس نڈ کی قربت میں آ جاتے تھے جس پر وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ ایک شہری بچہ تھا۔

اپنے پہلے گاؤں کی پہلے رات میں وہ بالکل اندھا ہو گیا تھا اور ہاتھ پھیلا کر انک کر لاکھ دوسو سو اور دل کو منٹھی میں لے کر قدم دھرتا تھا کہ ابھی ٹھوکر کھا کر گروں گا۔ جو ہڑ کے اندر... کسی درخت کے تنے سے جا ٹکراؤں گا۔ کسی کچی دیوار میں جا لگنے سے میری ناک چوٹی ہو جائے گی لیکن کچھ اندھیاری شبوں میں بھٹکنے کے بعد اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے... گاؤں کی شب دیہور میں.. کالی شاہ رات میں بھی کہیں روشنی کے کچھ ذرے ہوتے ہیں جو درختوں دیواروں اور انسانوں کو نیم نمایاں کر دیتے ہیں۔

اول حمد شالہی...

بچے کو مکوں پر ابھری راکھ ایسی سلیٹی رنگت کے گدھے پر سوار حضرت عیسیٰ چلے آ رہے تھے۔

ان کے سفید لشکیلے بال ان کے کندھوں تک آتے تھے۔

وہ صرف ایک سفید تہبند میں ملبوس تھے اور اس سے اوپر ان کا کھلا بدن اندھیرے میں بھی لو دیتا تھا۔

مشن سکول کے کلاس روم کی دیوار پر آویزاں اس نے حضرت عیسیٰ کی ایک تصویر دیکھی تھی.. اگرچہ وہ بہت ڈھکے ہوئے ایک لمبے چوٹے میں ملبوس ایک گدھے پر سوار تھے اور ان کے سر کے گرد ایک نورانی ہالہ روشن تھا.. لیکن پو آجی بھی ان سے کم نہ تھے۔

”پو آجی...“

پو آجی اسی لمحے... ایس عجائب ہائے اندر آدم در رکھ لایا... تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گدھے کو تھپک کر ”بس وچھیر یا...“ کہا... اور وہ انہی قدموں پر رک گیا.. پو آجی نے اوپر دیکھا.. وہ انہیں نڈ پر بیٹھا نظر تو نہ آیا لیکن انہوں نے بہر طور بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا۔ ”پتر خاور...“

”آہو پو آجی..“ وہ کود کر نیچے آ گیا۔

”آ جا...“ انہوں نے گدھے پر جگہ بناتے ہوئے ذرا پیچھے کھٹک کر کہا۔

خاور اسی جست کے تسلسل میں پھر کودا اور پو آجی کے آگے ان کی گود میں جا بیٹھا۔

”چل وچھیر یا۔“

گدھا پھر سے چلنے لگا۔

”پو آجی آپ اپنے پیر سے مل آئے۔“

”پتر وہ پیر نہیں اللہ لوک ہے۔“

”یہ اللہ لوک کیا ہوتا ہے پو آجی۔“

”جو اللہ کا لوک ہوتا ہے.. اس کا بندہ ہوتا ہے۔“

”ہم بھی تو اس کے بندے ہیں پو آجی...“

”آہو... پر وہ اللہ سے باتیں کرتا ہے۔“

”کیا باتیں کرتا ہے پو آجی؟“

”پتر یہ معرفت کی باتیں ہوتی ہیں.. ہم کینوں کی سمجھ میں نہیں آتیں..“

”کوئی زبان میں باتیں کرتا ہے پو آجی؟“

”پتر اللہ کی کوئی زبان نہیں ہوتی.. بنا شک پنجابی میں بات کر لو تو وہ سمجھ جاتا ہے..“

جیسے میاں محمد بخش صاحب کی باتیں سمجھ جاتا تھا..

”تو پھر پو آجی آپ خود ہی اللہ سے باتیں کر لیا کرو وہ سمجھ جائے گا.. اتنی دور جاتے ہو اللہ لوک کے پاس یہ سننے کے لیے کہ آج اللہ میاں نے کیا کہا ہے..“

”چپ کر کیا بینڈے کی طرح بولتا جاتا ہے.. اور میں نے تو تمہیں منا ہی کی تھی کہ رات کے وقت پنڈے سے باہر آ کر میری اڈیک میں نہ بیٹھا کر... تو کیوں آیا ہے؟“

”میرا جی چاہتا تھا پو آجی..“ پو آجی کے سوہنے اور سنہری ریشم ور گے گھسے کی خوشبو سے وہ خوش ہو گیا اور پھر بینڈے کے طرح ٹر ٹر بولنے لگا ”پو آجی جب آپ سانیوں کی ہنٹنی میں سے گزرے تھے تو وہ چستکرا بولی بھونکا تھا ناں؟“

”آہو... پر وہ مجھے کچھ کہتا نہیں ہے پر اس کے بھونکنے سے سانی اپنے چھپروں میں سے نکل کر میرے وچھیرے کو بڑی حسرت سے دیکھتے ہیں کینے..“

”پر کیوں نہیں مانتی پو آجی؟“

”تو چپ نہیں کرتا بینڈے..“

”نہیں چپ کرتا آپ بتائیں روح کیوں نہیں مانتی..“

”میرا دل کرتا ہے پتر کہ اس جہان میں آوازیں ہوں... بندے بشر تو باتیں کرتے ہیں ناں مجبوری کے لیے... دوسروں سے کچھ حاصل حصول کے لیے.. دل فریب کرنے کے لیے.. پردہ پوشی اور کچھ چھپانے کے لیے.. غیبت اور برائی کرنے کے لیے.. کوئی ایک آدھ بات میاں محمد بخش جیسی بھی ہوتی ہے پیار محبت اور الفت کی.. باقی تو سب فریب اور دکھاوا ہوتا ہے..“

”اس لیے آپ گوشت نہیں کھاتے پو آجی؟“

”اوائے بینڈے بات تو پوری سن لے.. چپ کر... تو باتیں بندے بشر کرتے ہیں اور آوازیں ڈھور ڈنگر.. جنور اور پرند کچھیر نکالتے ہیں... تو میرا دل کرتا ہے کہ اس جہان میں یہ آوازیں قائم رہیں.. بھیڑ بکریاں.. مال مویشی اور پرندے بولتے رہیں.. اگر ہم ان سب کو کھا جائیں گے تو خموشی ہو جائے گی ہر طرف.. سویرے سویرے چڑیاں نہ بولیں تو صبح رہ جائے گی..“

”پر پو آجی باقی سب لوگ کھاتے ہیں آپ نہیں کھاتے تو اس سے کیا فرق پڑے گا..“

”بینڈے.. میں نے آج تک اگر گوشت نہیں کھایا تو کوئی ایک وچھیرا یا بکرا تو رہ گیا ہو گا ناں.. کوئی ایک پرندہ تو آسمان پر اڑا ریاں مارتا ہو گا ناں..“

یہ منطق اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ ٹرانے سے باز آگیا اور چپ ہو گیا۔

بڑے جوہڑ کے کنارے گدھے کے پاؤں کچھڑ میں دھنسنے لگے۔ پو آجی نے اسے دو تین بار پیار سے تھپکا اور ”چل وچھیرے چل“ کہا تو وہ سر ہلاتا خشکی پر آگیا اور اطمینان سے چلنے لگا۔

خاور کے عین سامنے دو نوکیلے کان کھڑے تھے جو رات کی سیاہی میں دھیرے دھیرے ہلتے جاتے تھے۔ گدھا اپنے راستے سے خوب واقف تھا۔

بڑا جوہڑ پیچھے رہ گیا.. اس کی بوٹی میں پوشیدہ ٹراتے مینڈک اور جھینگروں کا شور بھی پیچھے رہ گیا..

”پر کیوں پو آجی؟“

”وہ اس کی کھال کو دیکھتے ہیں پتر... کہ جب یہ مر جائے گا تو پہلے اس کا گوشت کھائیں گے پھر کھال اتار کر چھیر کے کچے فرش پر بچھائیں گے..“

”یہ سانس کھوتا بھی کھا جاتے ہیں پو آجی؟“

”آہو... مردار کھاتے ہیں... کچھو کچھو ڈڈو اور کرلے بھی کھا جاتے ہیں کینے.. یہ تو پھر وچھیرا ہے..“

”پر پو آجی یہ تو گدھا ہے تو آپ اسے وچھیرا کیوں کہتے ہیں... کیوں پو آجی؟“

پو آجی نے ہاتھ آگے کر کے گدھے کی گردن پر ایک لاڈلی تھکی دی ”یہ عام کھوتا تو نہیں ہے پتر... اللہ لوک کے آستانے پر حاضری دینے والا جانور ہے... یہ ناں ہے تو کھوتا پر وچھیروں کی طرح پھر تیرا اور ستھرا ہے..“

”ستھرا تو آپ بناتے ہیں پو آجی... اسے نہلاتے ہیں کنگھیاں کرتے ہیں...“

”آہو.. پر اس کے کھوتا ہونے میں بھی ایک بڑا فائدہ ہے... اگر یہ سچ وچھیرا ہوتا ناں.. گائے کا بچہ تو رسول پور کے لوگ اسے کب کے ذبح کر کے کھا چکے ہوتے... اسے چوری کر کے... تو اب چونکہ یہ کھوتا ہے اس لیے اسے کھا نہیں سکتے... یہ فائدہ ہے..“

پو آجی نے سر جھٹک کر اپنے شانوں پر آئے سفید بالوں کو سنوارا اور ”ہو وچھیرے“ کہہ کر گدھے کو ذرا تیز چال میں ڈال دیا..

پو آجی گوشت بالکل نہیں کھاتے تھے...

خاور کے لیے یہ ایک حیرت ناک انکشاف تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے۔ عید بقر عید پر بھی نہیں کھاتے... بے شک سالن میں صرف ایک بوٹی ہو ہانڈی میں سے صرف شور بہ یا سبزی ان کی تھالی میں ڈال دیا جائے تو وہ منہ پھیر لیتے تھے کہ انہیں ماس کی بو آجاتی تھی.. خاور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ زندہ کیسے رہتے ہیں... مرغی بھی نہیں کھاتے تھے.. وہ اس کی زندگی میں پہلے شخص ایسے تھے جو گوشت سے پرہیز کرتے تھے۔

”پو آجی آپ گوشت کیوں نہیں کھاتے؟“ اس نے ایک مرتبہ پھر وہی سوال دوہرایا جس کے جواب میں پو آجی صرف اتنا کہتے تھے ”بس روح نہیں مانتی..“

”جو تلخ ہے ناں چلین کا.. اس کے بارے میں سنا ہے وہ پھینکی ناکوں والے سب کچھ کھا جاتے ہیں اسی لیے وہاں نہ مینڈک مڑاتے ہیں اور نہ جھینگر بولتے ہیں.. ہر طرف بس خموشی ہوتی ہے.. آہو۔“

یکدم تاریکی میں ایک اور تاریکی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھنی اور اندھی در آئی.. گدھا گاؤں کی پہلی گلی کے اندر داخل ہوا تو کچی اور موٹی دیواروں نے اسے گھیر کر باہر کی تاریکی کو روک کر مزید اندھیرا کر دیا.. پھر خاور کے سامنے جو دو نوکیلے کان مسلسل حرکت میں تھے ساکت ہو گئے اور گدھا رک گیا..

پو آجی نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے بڑی احتیاط اور آسانی سے اٹھایا اور نیچے اتار دیا.. نیچے ہوتے ہوئے اس کا ایک پاؤں نالی میں چلا گیا جسے اس نے مشکل سے کھینچ کر باہر نکالا لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ پاؤں کچھڑ سے بھر گیا ہے..

پو آجی کے سفید بال ان کے مضبوط اور ملائم کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور تاریکی میں وہ خود تو کم نظر آتے تھے لیکن ان کے بال صاف دکھائی دیتے تھے..

”پتر..“ پو آجی نے آہنی میٹوں اور کوکوں سے مزین چوٹی دروازے کو دھکیلنے سے پیشتر ایک ہاتھ سے دچھیرے کو تھپکا اور دوسرا ہاتھ پیار دینے کے انداز میں اس کے سر پر پھیرا.. ”میرے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے.. آج جمعہ کی نماز پڑھانے کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ اگلے جمعے.. اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا.. انہیں بشارت ہوئی ہے.. تم کسی اور سے ذکر نہ کرنا..“

”پو آجی..“

”چپ بینڈے۔“

”لیکن پو آجی..“

”چپ..“ انہوں نے سختی سے کہا..

پو آجی نے دروازہ دھکیلا.. اندر بھی اندھیرے کی راجدھانی تھی اور صحن میں کوئی نہ تھا.. سب لوگ کوٹھے پر اپنی چارپائیوں میں سفید کھیس اوڑھے نیند میں فنا تھے.. انہوں نے صحن کے کونے میں مویشیوں کی کشتی نما گھرنی کے پاس گدھے کو باندھا تھا کچا اور مڑ کر کہنے لگے ”چپ.. کسی کو بتانا نہیں...“

چھت پر اس کا بستر بچھا تھا اور اب تک اس کا سوتلی کھیس اور کھدر کی چادر گرمیوں

کی رات میں بھی خاصی ٹھنڈک جذب کر چکے تھے لیکن وہ پو آجی کے ہمراہ اوپر جانے کی بجائے اپنی کونٹھری میں چلا گیا..

دروازہ کھول کر گھپ اندھیرے میں دیکھتا اندر چلا گیا..

کونٹھری میں رنگین پایوں والی نواری چارپائیاں ایک ہاؤس آف کارڈز کی طرح ایک دوسرے کے اوپر ایسے قائم تھیں جیسے ابھی ابھی گر جائیں گی اور سب سے چٹکی چارپائی کی تنگی نواری پر اس کا سوٹ کیس دھرا تھا.. سفید نواری پر اس کا سیاہ سوٹ نمایاں نظر آتا تھا..

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر سوٹ کیس کو نزدیک کیا اور اسے کھول کر اس کونے میں ہاتھ پھیرا جہاں اسے بی سی بسکٹوں کا وہ ڈبہ موجود تھا جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لایا تھا.. اس نے ٹول کر صرف ایک چینی لگا بسکٹ نکالا اور اپنے منہ میں رکھ لیا.. اور چہائے بغیر اسے وہیں رہنے دیا.. اس بسکٹ کا بیکری میں پکا ہوا میدہ اور اس پر چپکے چینی کے دانوں کا ذائقہ اسے اس نامراد گاؤں سے واپس اپنے شہر لے جاتا تھا جہاں یہ بسکٹ ہوتے تھے.. سوڈا واٹر کی بوتلیں اور آکس کریمیں ہوتی تھیں.. اس سے پیشتر کہ یہ ذائقہ گھل کر حلق سے نیچے چلا جاتا زائل ہو جاتا اس نے کوٹ کی تہہ میں بچھے پرانے اخبار پر ہاتھ پھیرا.. وہ درجنوں بار دن کی گرم روشنی میں اس اخبار کو آنکھوں کے قریب لا کر اپنے شہر میں پہنچ جاتا کیونکہ یہ وہ صفحہ تھا جس پر لاہور کے سینما گھروں میں دکھائی جانے والی فلموں کے مختصر اشتہار تھے..

اوڈین، پلازا، ریگل، کمپنل، صنوبر، ریجنٹ.. ایسے طلسمی گھر جن میں ”چن“ ”جال“ ”دو آنسو“ ”نچ بیک آف نوٹرزیم“ اور ”نیا گرا“ ایسے جادو چلتے تھے..

وہ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اس صفحے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ان کی ایک ایک سطر اور تصویر سے آگاہ ہوتا تھا اور اسے یہ اطمینان ہوتا تھا کہ وہاں میرا ایک شہر ہے جہاں شاید اس لمحے یہ فلمیں سکرین پر چل رہی ہیں اور تماشائی سوڈا واٹر کی بوتلیں پی رہے ہیں..

اس نامراد گاؤں سے فرار اس کا سب سے بڑا خواب تھا..

اسے زبردستی.. تقریباً ہاتھ پاؤں باندھ کر رسول پور بھیج دیا گیا تھا..

صرف اینگلو ورنگلر کے فائنل امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے..

ماسٹر رحمت علی اس کے ابا جان کے بہت قریبی دوست تھے.. باریش اور بلند

قامت.. کرخت طبیعت کے اور نرمی سے یکسر نا آشنا شاہ صاحب.. شہر میں بچہ چوڑ ہو جاتا

ہے۔۔۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں اسے میرے ساتھ رسول پور بھیج دیجئے وہاں یہ ریڈیو اور فلموں وغیرہ کی لغویات نہیں ہوں گی۔۔۔ میں اسے پڑھاؤں گا۔ انشاء اللہ ورینکلر فائل میں اچھے نمبر لے گا۔ اصل امتحان تو یہی ہے میٹرک تو معمولی بات ہے۔۔۔“

شاہ صاحب نے اپنے اکلوتے بچے کو ورینکلر فائل پر بلا جھجک قربان کر دیا اور اسے ماسٹر رحمت علی کے سپرد کر کے گاؤں بھجوا دیا۔۔۔

یہ گاؤں پتہ نہیں کہاں تھا۔۔۔

شاید اس کا کوئی وجود نہ تھا اور یہ صرف ایک شہری بچے کو اذیت دینے کے لیے عارضی طور پر تخلیق کیا گیا تھا۔۔۔

گاؤں کہیں نہ کہیں تو ہوتے ہیں۔۔۔ لیکن یہ کہیں بھی نہ تھا۔۔۔

ریلوے تو بہت دور کی بات ہے۔۔۔ یہ کسی کچی سڑک کے آس پاس بھی نہ تھا جس پر کوئی مکا کی سواری اس کی قربت میں آسکتی۔۔۔ وہاں سے بھی کوسوں دور تھا۔۔۔

نزدیک ترین تہذیب یافتہ بستی جہاں پورے دن کی پیدل مسافت کے بعد پہنچا جاتا تھا کوئی قصبہ منگھو وال نام کا تھا۔۔۔ اور وہ بھی رسول پور کا ایک نسبتاً بڑا بھائی تھا۔ اُس قصبے کی تہذیب یافتگی کی سند ایک کچی سڑک اور صرف ایک ڈاکخانہ تھا جس کے عملے میں بھی صرف ایک شخص تھا جو جب کبھی اپنی بھینسوں کو چارہ ڈالنے اور دودھ دہنے سے فارغ ہوتا تو ڈاک کے لفافے اور کبھی کبھار ٹکٹ فروخت کرنے کے لیے ایک کچے کمرے میں آ بیٹھتا جس کے نصف حصے میں بھس کا ایک تودہ براجمان تھا۔۔۔

رسول پور سے اول تو کسی کو خط لکھنے کی حاجت ہی پیش نہیں آتی تھی اور اگر یہ وقوعہ ناگزیر ہو جاتا تھا تو اس خط کو لکھنے والا صرف ماسٹر رحمت علی تھا جو اس خط کو لکھنے کے بعد اسے اپنے تہبند کی کسی گرہ سے اڑس لیتا اور وہ مدتوں وہیں رہتا کہ اسے پوسٹ کرنے کے لیے ایک لفافہ درکار ہوتا اور وہ ڈاک کا لفافہ صرف منگھو وال کے ڈاکخانہ سے ہی فراہم ہو سکتا تھا اور اکثر اوقات نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ پوسٹ ماسٹر کی کوئی بھینس دودھ دینے سے انکاری ہو جاتی تھی اور جب تک وہ دودھ نہ دے پوسٹ ماسٹر صاحب کیسے ڈاکخانے میں آسکتے تھے۔ اور اگر یہ لفافہ کسی آنے جانے والے کے ہاتھوں وہاں سے منگوا بھی لیا جاتا تو خط اس میں ڈال کر پھر سے اسے منگھو وال بھجوا کر پوسٹ کرنے کا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔

چنانچہ رسول پور میں خط و کتابت کا کچھ زیادہ رواج نہ تھا۔۔۔

پورا گاؤں کچا تھا۔۔۔

صرف ماسٹر رحمت علی کا پیار پکا تھا۔۔۔ لیکن وہ کوٹھڑی بھی کچی تھی جس میں نواری چارپائی پر اس کا سیاہ سوٹ کیس بے وجہ لگتا تھا۔

شہر کی نسبت رسول پور کے آسمان پر ستاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ چمکتے بھی بہت بے بہا تھے۔۔۔ ابھی رات کے بھگینے سے جو مدھ بھری غنودگی وارد ہوتی ہے خاور اس میں گم اور بے ہوش ہوتا تو چاچا ماسٹر کی کرخت آواز اسے بیدار کر دیتی۔ ”اُدے خاور۔۔۔ دوپہر ہو گئی ہے اور تو سویا پڑا ہے۔۔۔ اٹھ۔“

وہ آنکھیں ملتا اٹھتا تو دوپہر میں ستارے روشن ہوتے۔۔۔

بچے صحن کی تاریکی میں سے اول نمبر چاچی کی مدھانی کی آواز بلند ہو کر ستاروں تک یہ خبر لے جاتی کہ چائی میں گھومتی مدھانی میں مکھن گھنا ہو رہا ہے اور دودھ کے رڑھکنے سے زور لگ رہا ہے۔۔۔ مدھانی کی روانی کو ادھ رڑھکنے کی گھنی آزمائش روکنے لگتی۔

چاچا ماسٹر کی یہ دیہاتی بیوی جو اول نمبر تھی ادھیڑ عمر اور بوسیدہ تھی۔ وہ ہمیشہ سیاہ کرتے اور تہبند میں ملبوس ہوتی اور اس کے پورے سراپے میں سے لسی کی بو آتی۔۔۔ وہ سارا سال اس گھر کی اور پو آجی کی دیکھ بھال کرتی۔۔۔ برسات کی آمد سے پیشتر بڑے جوہڑ سے مٹی لا کر اس میں بھس ملا کر چھت پر لپ کر تی اور سردیوں کے دوران پو آجی کے خشک ہوتے بچے پر مکھن سے مالش کرتی۔۔۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب اس کا خاوند شہر لاہور میں ماسٹری کر کے لوٹا تو پھر اس کی خدمت پر رنجت جاتی۔۔۔ اس سے کبھی چاچی نمبر دو کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھتی جو سوہنی گوری چنی اور کم سن تھی اور جسے وہ شہر میں چھوڑ آتا تھا کیونکہ گاؤں کی آب و ہوا اسے راس نہ آتی تھی اور اسے نزلہ زکام ہو جاتا تھا۔

اول نمبر چاچی کے لیے یہ بہت تھا کہ وہ ہر برس دو ماہ کے لیے اس کے ہاں۔۔۔ اس کے صحن میں۔۔۔ اپنے والد پو آجی کے پاس لوٹ آتا ہے۔۔۔

ماسٹر رحمت علی ان دو ماہ کے دوران اس کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔۔۔

اول نمبر چاچی کی کوئی اولاد نہ تھی۔۔۔

اور چاچی نمبر دو نے بچوں کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔۔۔

ماسٹر صاحب نے اپنے رہن سہن کا بندوبست کچھ یوں کر رکھا تھا کہ آج تک دونوں چاچیوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اول نمبر چاچی نے اپنے خاوند کو دوسری بیوی کے فراہم کردہ بچوں کے ذمیر میں سے کسی ایک بچے کو دیکھا تھا۔ ماسٹر صاحب کی شہری حیات الگ تھی اور گاؤں کی زندگی بالکل تھلگ۔۔۔

تو جب وہ اس تاروں بھری دوپہر کی تاریکی میں آنکھیں ملتا ڈولتا ہوا اپنی دھوٹی سنبھالتا اٹھتا کچی میٹر جیوں سے نیچے ویڑے میں آتا تو دودھ رڑھکنے کی آواز بلند ہو جاتی۔۔۔ چائی کے بند منہ میں مدھانی گھوم گھوم کر انکنتی اور دھم دھم کی ایک ایسی ردھم ویڑے کو بھرتی جاتی جیسے سیٹھو سکوپ میں دل کی دھڑکنے کی آواز دھم دھم سنائی دیتی ہے۔۔۔

اول نمبر چاچی اپنے خصم کی ”اوئے دوپہر ہو گئی ہے اٹھ۔۔۔“ کی پاٹ دار آواز سننے کے چند لمحوں بعد مدھانی کی مٹیوں پر گرفت ڈھیلی کر کے رک جاتی اور پیچھے مڑ کر دیکھتی تو خاور آخری میٹر جی سے ویڑے میں قدم رکھ رہا ہوتا۔ ”آ جا ماں صدقے۔۔۔“

خاور ڈولتا ہوا نیم اندھیرے میں چاچی کے قریب پہنچتا تو وہ مدھانی چائی میں سے نکال کر ایک کھلے منہ والے تانبے کے کنورے پر چائی کی گردن پکڑ کر اسے جھکاتی اور ادھ رڑھکا مکھن سے گھنا ہوتا دودھ کنورے کو بھر دیتا اور وہ تاریکی میں ایک سفید چاند کی طرح چمکنے لگتا۔ خاور کنورے کے بھرتے ہی کہتا ”چاچی چینی“

”آہو جی۔۔۔“ وہ ہنستی۔ ”شہریے چینی بغیر ادھ رڑھکلیا بھی نہیں پیتے۔۔۔ میں لاتی ہوں۔“

چینی خاور والی کچی کو ٹھڑی میں لگی گھڑوں کی پال کے سب سے اوپر والے گھڑے میں سنور تھی۔ چاچی اس میں سے مٹھی بھر کر لے آتی اور ادھ رڑھکے دودھ میں ڈال کر اسے انگلی سے خوب ہلا کر کنورے سے تھما دیتی۔۔۔

یہ گھنا نیم مکھن دودھ انک انک کر اس کے حلق سے اترتا۔ اور اس کی آنکھیں اس کے سرور سے پھر سے بند ہونے لگتیں۔ وہ اپنے بدن کے مختلف حصوں کو کھجلا تا دو تین جمائیاں لیتا اور کوکوں سے مزین بھاری دروازہ دھکیل کر گلی میں آ جاتا۔ کچی دیواروں کو ٹٹولتا نالیوں سے بچتا وہ ہولے ہولے آگے بڑھتا اور جب وہ گاؤں سے باہر نکل کر رسول پور نہر تک پہنچتا تو ہلکی سی روشنی پھیلنے کو ہوتی اور اس میں کچے کوٹھے، کھیت، جوہڑ اور گھریلوں کے

ساتھ بندھے ڈنگر مویشی ظاہر ہونے لگتے۔

خاور کے لیے اس نامراد گاؤں میں یہ نہر تہذیب کی واحد علامت تھی۔۔۔

یہ نہر۔۔۔ سوٹ کیس میں بچھا پرانا اخبار اور اے بی سی بسکٹوں کا ڈبہ۔۔۔

وہ پڑی پر کچھ دور تک جاتا اور پھر نیچے اتر کر پانی کی قربت میں جہاں گھاس اور

بونیوں کی بہتات تھی وہاں لیٹ جاتا۔

گھاس میں تریل کی نمی اس کے سارے جسے کو ٹھنڈا کر دیتی اور وہ اُن ٹکوں کو جو اس کے منتھوں کے آگے سرسراتے ان میں گدگدی کرتے تھے۔ توڑ کر انہیں پانی میں پھینک دیتا اور فوراً ہی گہری نیند میں چلا جاتا۔

اگرچہ چاچا ماسٹر کا یہ خیال تھا کہ وہ صبح سویرے بیدار ہو کر نہر کنارے ایک لمبی سیر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کی صحت بہتر ہوگی اور وہ خوب چاق و چوبند ہو کر ورثہ کے امتحان کی تیاری کرے گا اور پوزیشن حاصل کرے گا۔ لیکن یہ محض خیال تھا۔

وہ مکمل طور پر گہری نیند میں تو نہیں جاتا تھا بس غنودگی کی ایک مست اور ٹھنڈک والی کیفیت میں سرشار لیٹا رہتا۔ نہر کے مدھم بہاؤ کی سرسراہٹ اس کے کانوں میں اترتی رہتی۔ اترتی رہتی۔ پھر ڈنگر مویشیوں کی گھنٹیاں دور سے سنائی دیتیں۔ قریب آتی رہتیں اور ”اوئے مریں“ ”اوئے متیوں چور لے جان“ پکارتا اور کوستا کوئی کسان مویشیوں کو ڈنگوری سے ہانکتا پڑی پر سے گزر جاتا۔ یہ آوازیں بہت دور کی لگتیں۔ اس کے بدن کے اندر گھنٹیاں بجائیں تیرتی نکل جاتیں۔ وہ پڑی سے نیچے پانی کے قریب تریل اور ہریاول کی گود میں گچھا ٹھٹھا ہو کر اوگھتا رہتا۔ نہر کے پہنے کی آواز کچھ مدھم ہونے لگتی اور چڑھتے سورج کی کچھ کریمیں پانی میں آگھلتیں اور نہر کا وہ حصہ جو ان کریموں کی زد میں آتا تھم جاتا۔ اور اس کے گرد جو پانی ابھی نیم سیاہی میں ہوتے بہتے جاتے۔ چمکتے پانی کے اس حصے کی لٹک سے اس کے بند پونے روشنی سے بھر جاتے۔ اور یہی وقت ہوتا تھا کسل مندی سے اٹھنے کا اور گھاس کے گیلے ٹکوں کو بالوں میں سے نکالنے اور گھر واپس جانے کا۔۔۔

وہ گھر لوٹا تو چاچا ماسٹر اور پو آجی ڈیرے کو جا چکے ہوتے۔۔۔

وہ اپنا بستہ سنبھالتا دھوٹی کو گرنے سے بچاتا گاؤں سے نکل کر بڑے جوہڑ کے کنارے چلتا کیکر کے ٹنڈ کے قریب سے ہو کر سانیوں کی ٹھنڈی سے ذرا پرے ہو کر ڈیرے

پر پہنچ جاتا..

چنگبر اُبولی اسے دور سے دیکھ کر ایک بار تو ضرور دم بخوب کر اٹھتا اور جبرے کھول کر غرائے کا ارادہ کرتا اور پھر اسے دھوتی کی شرافت میں ملبوس پا کر یہ ارادہ ترک کر دیتا۔ وہ تو صرف اس کی شلوار کے پائینے کا دیوانہ تھا..

ڈیرے پر شیشم کے پانچ درخت تھے.. ان کے نیچے بان کی تین چار پائیاں تھیں دو گھڑے تھے اور ایک چارے کی کھری تھی جو پو آجی کے گدھے کے لیے مخصوص تھی.. ارد گرد کھیتوں کا پھیلاؤ تھا..

کچھ چارے کے کھیت تھے.. پھر گنے کے بوٹوں کی بلند دیواریں تھیں اور ڈیرے کے برابر میں جو کھیت تھا اس میں سہاگا پھرا ہوا تھا..

وہ گوٹھ مار کر اپنی دھوتی سے اپنے درمیان کو ڈھکتا بان کی بے آرام کھردری چار پائی پر ابھی بیٹھ ہی رہا ہوتا کہ چاچا ماسٹر اسے حساب کے سوال حل کرنے کے لیے ایک کاپی تھما دیتے جس پر انہوں نے سینکڑوں کی تعداد میں سوال بنا رکھے ہوتے تھے..

دس بجے کے قریب اول نمبر چاچی کما د کے کھیتوں کے کنارے پانی کے کھال کے کنارے ایک مختصر سی بنی پر چائی سر پر اٹھائے اس پر ایک دسترخوان رکھے اطمینان سے چلتی ہوئی ڈیرے کی جانب آتی نظر آنے لگتی..

یہ بریک فاسٹ نام ہو جاتا تھا..

پو آجی کے لیے کچی لسی.. چاچا ماسٹر کے لیے دو پرائٹھے اور اچار.. اور اس کے لیے تندور کی باسی روٹی.. تازہ مکھن اور چائے.. اور چینی کی ایک پڑیا جو وہ مکھن پر چھڑک کر روٹی کے ساتھ کھاتا اور ساتھ میں خالص دودھ کی چائے کے گھونٹ بھرتا.. یہ رات کی باسی روٹی اور اس پر مکھن اور چینی.. کسی بھی ڈبل روٹی سے زیادہ خستہ اور مزیدار ہوتی تھی..

پھر سارا دن حساب کے سوال.. کھیتاں.. دھوپ تیز ہوتی تو کھیتوں سے آنے والی گوبر اور فضلے کی بو.. اردو گرائمر.. انگریزی کے جواب مضمون.. چاچا ماسٹر پانچویں جماعت کے کورس کی کتابیں تصنیف کرتے رہتے جو اردو بازار کا ایک ناشر ٹھیکے پر ان سے لکھواتا تھا..

سورج غروب ہونے لگتا تو وہ پو آجی کے ہمراہ گاؤں واپس چلا جاتا..

جب پہلے روز وہ اس کالے پانی کی قید کائنات کے لیے شہر سے ایک طویل مسافت

کے بعد مکھو وال کے قصبے میں بس سے اترتا تھا اور پھر فوری طور پر اس ویران سے قصبے سے باہر نکل کر اپنے آگے آگے چلتے چاچا ماسٹر کی لمبی لمبی پلاہنگوں کے پیچھے پیچھے تقریباً بھاگتے بے حال ہوتے اور گرتے ان کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوتا تھا.. اور اباجان تو جب کبھی اس کے آگے چلتے تھے تو ہر دو قدم پر رک کر پیچھے دیکھتے تھے کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں لیکن یہ جو چاچا ماسٹر تھے انہوں نے تو اس ویران دو پہر کی بر باد جہنمی گرمی میں اسے بارہ میل کی مسافت کے دور ان.. کھیتوں.. رڑھے میدانوں.. ٹیلوں.. قبرستانوں.. بل چلائی اونچی نیچی زمینوں اور پانی کی خشک کھالوں میں چلتے ہوئے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر یہ اطمینان نہیں کیا تھا کہ وہ آ بھی رہا ہے یا نہیں.. یا وہیں بس کے باہر ہی کھڑا رہ گیا ہے.. نہ پانی کا پوچھنا آرام کرنے کو کہا.. بس لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلتے گئے اور وہ ان کے پیچھے سر اسیمہ اور خوفزدہ اس لیے کہ اگر یہ آگے نکل گئے اور میں یہیں رہ گیا تو اس بھری دو پہر میں اس ویرانے میں میرے ساتھ کیا ہو گا.. وہ کبھی تیز چلتا.. کبھی ڈڑکی لگاتا.. پیاس کی شدت سے اور پسینے کی رم جھم میں.. ان کے پیچھے پیچھے..

چاچا ماسٹر نے رسول پور پہنچ کر اپنے گھر کا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تو صحن کی ویرانی کے ایک کونے میں سلگتے اپلوں پر رکھی ایک چائی کے قریب سیاہ پوش چاچی بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اور ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی انہوں نے پوئی ہاتھ سے رکھ دی اور سیاہ چادر کا گھونگھٹ چہرے پر اتار لیا۔ چاچا ماسٹر نے تب بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ در نیکل فائنل والا بچہ زندہ بچ بھی گیا ہے یا نہیں.. چاچی کو ایک واجبی سا سلام کر کے کہنے لگے ”یہ اپنے شاہ صاحب کا بیٹا ہے خاور.. گرمیوں کی چھٹیوں میں ادھر ہی رہے گا“.. اور چاچی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنے دس ماہ سے گمشدہ خاوند پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر اس کے سر پر ایک پینڈو پیار دیا ”جی آیاں نون پتر..“

”پتر..“ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی.. اس لیے کہ وہ بے اولاد تھی..

رسول پور کا دور افتادہ کچا گاؤں اور اس کی چیلوں سے چھیتی بھری دو پہریں اسے ہول سے بھر دیتی تھی.. اسے یقین نہ آیا کہ زندگی اتنی ٹھہری ہوئی ساکت اور بے مقصد بھی ہو سکتی ہے.. بس صبح ہوتی ہے اور پھر شام ہوتی ہے.. اور پھر شام ہوتی ہے.. اور گرم دو پہر ہے جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتی.. کھیتوں میں گوبر کی بو ہے.. رُودھری پر فضلے کی خشکی

محسوس کرنے لگا۔

چاچا ماسٹر اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ اس کی صحت اس کی پڑھائی اور اس کی خوراک کا خیال رکھتے تھے لیکن اس کا خیال نہیں رکھتے تھے وہ ان کے لیے ورنیکلر فائنل کے امتحان کا ایک نالائق پرچہ تھا جسے انہوں نے لائق بنانا تھا۔

پو آجی زیادہ فریڈی نہیں تھے۔

ان کی عمر کم از کم سو برس کے لگ بھگ تھی۔ یا شہری بچے کی جتنی عمر تھی اس عمر میں وہ سو برس کے لگ بھگ ہی لگتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایک سفید تہبند میں ملبوس ہوتے۔ اس سے اوپر کا بدن ڈھانپنا جمعے کی نماز کے علاوہ گناہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ پتر یہ بخسہ تو سوہنے رب نے ہنڈانے کے لیے دیا ہے۔ برتنے کے لیے دیا ہے اس پر کچھ بہن لو تو جسے کا ساہ بند ہو جاتا ہے۔ اور ان کا بدن ایک نرلی گھوڑی کی طرح چکنا ملائم اور بنا چربی کے تھا۔ ان کے کندھے بھی ایسے تھے کہ ان پر ہاتھ رکھنے سے ہاتھ پھسلتا تھا۔ البتہ وہ اپنے پنوں کا۔ کندھوں تک آتے سفید چمکیلے بالوں کا خاص خیال رکھتے۔ انہیں نہایت اہتمام سے نگرانی کی ایک کنگھی سے سنوارتے رہتے۔ ڈیرے پر جب وہ بان کی چارپائی پر گونٹھ مارے حساب کے سوال حل کر رہا ہوتا پو آجی ایک گھر پی سے کھیتوں میں گودڑی کرتے رہتے۔ پھر تیلے اتنے کہ پانی کا چوڑا کھال آسانی سے پھلانگ جاتے۔ اپنی چارپائی اٹھا کر بل چلے کھیت میں چلتے تو ان کی کمر میں بل نہ آتا۔ اور کان اتنے تیز کہ اگر ان کے کماؤ کے کھیت میں سے جو خاصے فاصلے پر تھا کوئی ایک گنا توڑتا تو وہیں ڈیرے پر بیٹھے ہوئے اپنے گدھے کو تھپکتے ہوئے اس گنے کے ٹوٹنے کی مدھم سرسراہٹ سن لیتے بلکہ گنا چور کی صنف کا تعین بھی کر لیتے۔

چاچا ماسٹر سے ان کی زیادہ دوستی نہ تھی۔ اگرچہ ان کی کل اولاد میں سے۔ گیارہ بال بچوں میں سے صرف وہی تھے جو اب تک حیات تھے لیکن وہ ان سے پرے پرے رہتے تھے سلام دعا کے سوا ان سے کوئی کلام نہ کرتے۔ وہ ان کی نسبت اپنے گدھے کے زیادہ قریب تھے۔

پو آجی اپنی ذات میں گم۔ ایک الگ زندگی گزارتے۔

انہوں نے خاور کو بھی کبھی کسی التفات سے نہ نوازا۔ کبھی اس کے سر پر ہاتھ نہ پھیرا۔ بس ڈیرے پر پہنچنے پر اس کے سلام کا جواب دیتے اور اپنے گدھے کو تھپک کر گھر پی ہاتھ میں لے کر کھیتوں کے اندر چلے جاتے۔

میں سے بدبو اٹھتی ہے۔ جو ہڑ کے کچھ بھرے گدھے مینڈک بھرے پانیوں میں سے سورج کی تپش سے متلی اور بخارات اٹھتے ہیں۔ گاؤں کے مکین خاموش ہیں اور اسے عجیب نظروں سے دیکھتے گزر جاتے ہیں۔ اور چٹکبرا بولی ہے جو اس کی شلوار کے پائینے کا شائق ہے۔ ایک ڈیرہ ہے۔ پانچ شیشم کے درخت۔ تین بان کی چارپائیاں۔ دو گھڑے۔ ایک کھری اور ایک گدھا۔ اس ہول سے اس ویرانی کے ڈر سے اسے بخار آنے لگا۔ لیکن اس نے کسی سے تذکرہ نہ کیا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اپنے بوجھ پر تھا۔ جنہوں نے اسے جان بوجھ کر اس ہول میں دھکیل دیا تھا۔ وہ ان سے کشتی لڑنا چاہتا تھا انہیں زمین پر گرا کر ان کی چھاتی پر کئے مارنا چاہتا تھا۔ اسے ان سے ایسی سنگدلی کی ہرگز توقع نہ تھی۔ شاید وہ ان کا اصلی بیٹا نہ تھا۔ نقلی بیٹا تھا جسے وہ کسی کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر لائے تھے۔ بس یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ وہ تو ایک شہری بچہ تھا۔ اسے شہر چاہئے تھا۔ سوڈاواٹر، فلمیں، آکس کریم، بسکٹ، بجلی اور شلوار چاہیے تھی۔ کرکٹ کھیلنے کے لیے دوست چاہیے تھے۔ اور یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے چلچلائی دوپہروں کی کچی دیواروں، گرمی میں اٹلتے جوہڑوں اور ایک بے بسی کے۔ کہ شہر یہاں سے صدیوں کے فاصلے پر تھا۔ پہلے دس بارہ میل پیدل مارچ کرو۔ پھر مگھو وال آئے گا۔ وہاں دن میں ایک لاری آئے گی۔ پھر کہیں گاڑی آئے گی اور پھر کہیں۔ وہ ابا جان کا نقلی بیٹا تھا یقیناً۔

اس نے ابا جان کو فوراً ہی ایک درد بھرا وقت آمیز خط لکھا جس کے آخر میں اس نے زندگی میں پہلی بار ”آپ کا اکلوتا بیٹا خاور“ لکھا اور وہ خط پورے دس دن اس کی حساب کی کاپی میں پڑا رہا۔ کیونکہ ڈاک کا لفافہ نہ تھا۔ اور جب بالآخر مگھو وال سے آنے والا ایک کہار وہاں اپنے گھرے پہنچنے کے بعد چاچا ماسٹر کی فرمائش کے مطابق ایک ڈاک کا لفافہ لے کر آگیا تو اس نے بے چارگی میں اور بے بسی میں اور شدید طیش کی حالت میں اس خط کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ ابا جان بھی نقلی تھے انہیں یہ خط بھیجنے سے فائدہ!

اس کی موجودہ زندگی میں صرف پانچ کردار تھے۔ چاچا ماسٹر۔ چاچی جی۔ پو آجی۔ گدھا اور چٹکبرا بولی کتا۔ ان کے علاوہ اس نادار گاؤں میں اور کوئی نہ تھا۔ کچے گھروں کے اندر کوئی نہ تھا۔ بس ویرانی تھی اور دوپہریں تھیں اور ہول تھا۔

پھر ایک روز اس نے صبح سویرے نہر پر جا کر سیر کرنے کی اجازت چاہی۔ اور درزنداں میں ایک آبی روزن کھل گیا۔ وہ کم از کم سویرے کے چند لمحوں میں زندہ اور آزاد

پو آجی سے اس کی دوستی کا آغاز رسول پور سے آمد کی ستر ہوئی سویر سے ہوا۔
خاور حسب معمول اس سویر بھی یا اس سویر کی آمد کی قربت میں نہر کے پانیوں کی
نزدیکی میں گھاس اور تریل کی نم آلود ٹھنڈک میں گچھا چھتا ہو کر اونگھ رہا تھا جب اس نے
ڈنگروں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں اور ”اوئے مریں.. اوئے تینوں چور لے جان“ اور پانی
کے بہاؤ سے الگ ایک اور آواز سنی..

اول حمد خدا دی کرے جو مالک ہر ہر دا..

اس نے آنکھیں کھول دیں کہ یہ آواز بہت نزدیک سے آرہی تھی۔

اس نے کہنیوں پر ٹیک لگا کر اپنے آپ کو گھاس میں سے ذرا اونچا کیا۔

پو آجی تھے..

ان کا گدھا تھا..

اور وہ سیاہ چمڑے کے بو کے کو نہر میں ڈبو کر پانی سے بھر کر اسے اپنے گدھے پر
اٹھیل کر اسے نہلا رہے تھے اور اول حمد خدا دی.. گارہے تھے..

خاور اٹھ کر گھاس میں بیٹھ گیا.. اور پو آجی اور ان کا گدھا صاف نظر آنے لگے۔

لیکن پو آجی مگن رہے.. بو کے کو نہر میں ڈبو کر بھرتے اور نہایت اہتمام سے کبھی
گدھے کے سر پر اور کبھی پشت پر اٹھیلے.. گدھا بھی اس غسل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور
بالکل بُت بنا اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ انہوں نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں حالانکہ وہ ان کے
بالکل سامنے گھاس پر براجمان انہیں تک رہا تھا.. وہ اپنے دچھیرے کے ساتھ کچھ راز و نیاز
بھی کر رہے تھے لیکن ذرا سرگوشیوں میں اور اس کے لمبو ترے ایستادہ کانوں میں جو اس تک
نہیں پہنچ رہے تھے.. گدھے کو دیہی صابن کی چاکی سے مل کر نہلانے کے بعد انہوں نے
تہبند کی ڈب میں سے اپنی لکڑی کی کنگھی نکالی اور اس کے بال سنوارنے لگے.. ایال سے فارغ
ہو کر وہ اس کی دم پر کنگھی پھیر رہے تھے۔ جب خاور نے کہا ”ہیلو پو آجی...“

”اوئے...“ وہ چونک گئے... وہ تھوڑے سے اڑے ہوئے تھے یعنی ذرا خمیدہ تھے
اس لئے جب انہوں نے ”اوئے“ کہا تو وہ دیکھ تو زمین کی طرف رہے تھے اور انہوں نے سر
اٹھانے کی بجائے صرف آنکھوں کے پوٹوں کو اونچا کر کے اس کی جانب دیکھا ”اوئے
شہریے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”میں جی؟... میں تو یہاں سیر کر رہا ہوں... ورنیکٹر فاسٹل کا امتحان دینا ہے ناں
میں نے..“

”یہ سیر ہے...“ وہ ذرا سیدھے ہو گئے۔

”ہاں جی... پر آپ ماسٹر صاحب کو یہ نہ بتائیے گا کہ میں یہاں آکر سو جاتا ہوں۔“

”ماسٹر صاحب سے کوئی بول بولے ہوئے مجھے تو مدتیں ہو گئی ہیں شہریے... میں
نے کیا بتانا ہے۔“

”پر وہ آپ کے بیٹے ہیں.. آپ کیوں نہیں بولتے.. میرے ابا جان تو چپ ہی
نہیں ہوتے۔“

”اوہر آؤ..“

خاور اپنے گھاس کے مسکن سے اٹھا اور ان کے گدھے کے دوسری جانب جا کھڑا ہوا۔
ابھی نیم تار کی تھی۔ ابھی نہر کے پانی کا ایک پیوند سورج کی کرنوں کی لشک سے
بہاؤ سے جدا نہیں ہوا تھا..

”بیٹا ہونے سے کیا ہوتا ہے.. کچھ بھی نہیں۔ میرے اور بھی بیٹے تھے جو چلے گئے
اور مجھے ان کی قبریں بھی یاد نہیں... اسے شوق تھا پڑھائی کا... یہ شہر چلا گیا اور وہاں ماسٹر
ہو گیا.. اب گرمیوں کی چھٹیوں میں اوہر آ جاتا ہے تو مجھے تو اس کی شکل بھی بھول چکی ہوتی
ہے.. بیٹا ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

”آپ کبھی شہر نہیں گئے؟“ وہ پوچھنا تو یہ چاہتا تھا کہ آپ نے کبھی سوڈا واٹر نہیں پیا..

آئس کریم نہیں کھائی... ”نیا گرا“ فلم نہیں دیکھی.. مارلن منرو کو نہیں دیکھا۔

”نہیں.. میں تو کبھی مکھو وال بھی نہیں گیا..“

”کیوں؟“

”کیوں جاؤں؟“

اس کا جواب اسے سوچنا نہیں.. اور وہ گدھے کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگا.. اس
کے بال ابھی تک گیلے تھے..

اس روز اسے معلوم ہوا کہ رسول پور سے آٹھ کوس کے فاصلے پر کسی کٹر زدہ
رقبے میں کوئی ویرانہ ہے جہاں ایک کچے ڈھارے میں پو آجی کا پیر اللہ لوک رہتا ہے۔ اسی لیے

وہ ہر جمعے کے روز اپنے گدھے کو نہلاتے سنوارتے تھے۔ پھر آنکھوں میں سرے کی سلائیاں پھیر کر عطر پھیلانے کی خوشبو لگا کر دھلا ہوا تہبند باندھ کر اس پر سوار ہو کر سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ وہ جمعہ کی نماز اپنے پیر کی امامت میں پڑھتے تھے اور پھر خطبے میں اس کی بشارتیں سنتے تھے اور رات کو واپس آتے تھے۔ اور آج جمعہ تھا۔

بس اس سویرے کے بعد پو آجی فرینڈلی ہو گئے۔

وہ اب ہر جمعے کو شام ڈھلے بڑے جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹنڈ کے اوپر چڑھ جاتا۔ اتنا اوپر کہ اگر وہ چٹکیرا بولی ادھر آنکے تو اس کی تھو تھنی اس تک نہ پہنچ پائے۔ اور یوں بھی اس پاس بیٹھنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔ اور پھر پو آجی کی واپسی کا انتظار کرنے لگتا۔

چاچا ماسٹر نے اس دوستی کو پسند نہ کیا۔

”بچے...“ ایک روز حساب کا کوئی سوال غلط حل کرنے پر انہوں نے اس کے کان کو نامناسب حد تک کھینچا ”سوال غلط ہے۔ میں نے شاہ صاحب سے وعدہ کر رکھا ہے کہ تو ور ٹیکلر فاکسل میں اچھے نمبر حاصل کرے گا۔ اور تو دھیان نہیں کرتا۔ پو آجی کے ساتھ وقت ضائع کرتا رہتا ہے۔ اس بابے کا دماغ کام نہیں کرتا۔ بڑھاپے سے الٹ گیا ہے۔“

”پر چاچا جی وہ تو آپ کے بھائی ہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

”ابا جی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا بچے۔ وہ ایک خود غرض بابا ہے۔ اس کے ساتھ وقت نہ ضائع کیا کر۔“ یہ منطق اس کی سمجھ سے بالکل باہر تھی کیونکہ اس کے لیے تو ابا جی ہونے سے ہی سب کچھ ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے اس نامراد گاؤں میں بھیج دیا تھا۔

اگلے روز۔ اس رات سے اگلے روز جب پو آجی نے اسے بتایا تھا کہ ان کے اللہ لوک کو بشارت ہوئی ہے کہ ایک اور طوفان نوح آنے کو ہے اور اگلے جمعے پوری دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پو آجی اس سے دُور دُور رہے۔

عام طور پر سارا دن کھیتوں میں گوڈی کرنے اور کھال مرمت کرنے کے بعد وہ ڈیرے پر واپس آکر الائی چارپائی پر لیٹ جاتے اور اگر چاچا ماسٹر کہیں گئے ہوتے تو اس سے باتیں کرتے رہتے لیکن اس روز وہ واپس تو آئے لیکن اپنی چارپائی سر پر اٹھا کر کچھ کہے بغیر کما کے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔

شام کو گھر آئے تو ان کی سیاہ پوش اولین بہو نے ان کے آگے تندور کی موٹی

روٹیاں اور دودھ کا کٹورا رکھا لیکن وہ اسے ہاتھ لگائے بغیر خاموشی سے کوٹھے پر جا کر سو گئے۔

پو آجی پورا ہفتہ اس سے دُور دُور رہے۔

وہ سلام کرتا تو وہ جواب بھی نہ دیتے۔

شاید چاچا ماسٹر درست کہتے تھے کہ ان کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔ ان کی بے اعتنائی سے اسے بہت دکھ ہوا۔ اور وہ بھی ان سے کتراتے لگا روٹھ سا گیا۔

جمعہ کی سویرے تھی۔

خاور گھاس اور تریل کی ٹھنڈک میں نہر کے پانیوں کے پہلو میں نیم تاریک سویرے میں اوگھٹتا تھا جب اسے ”اول حمد خداوی کرے۔“ کے بول سنائی دیئے۔

وہ گھنٹیوں سے ٹیک لگا کر ذرا اوپر ہوا پو آجی اپنے گدھے کو نہلاتے تھے۔

وہ ان سے ناراض تھا۔ کہنیوں کو ڈھا کر پھر لیٹ گیا۔ ان کی نظروں سے روپوش ہو گیا۔

”اوائے شہرے۔ ناراض ہے؟“

”نہیں جی۔“ وہ فوراً خوش ہو گیا کہ پو آجی راضی ہو گئے ہیں۔

”میرے ساتھ چلے گا؟“

”کہاں پو آجی۔“ وہ اپنے گوشے میں سے باہر آگیا۔

”اللہ لوک کے ڈیرے پر۔“

”چاچا ماسٹر سے پوچھوں گا۔ وہ اجازت دیں گے تو۔“

”چپ۔“ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر غصے سے کہا ”کسی سے کچھ نہیں کہنا۔ تمہارا ماسٹر تو سمجھتا ہے کہ میرے دماغ میں فتور ہے۔ چپ چہیتے چلنا ہے تو چل۔“

”نہیں پو آجی۔“

”اوائے چل شہرے چل۔“ پو آجی نے بے حد لجاجت سے کہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ان کے ریشمی جوتے پر اس کا منہ تھا اور وہ اس میں سے ایک عجیب مہک سونگھتا تھا ”نن اور غور سے سن۔ آج جمعہ کا دن ہے۔ یہ آخری دن ہے اس دنیا کا۔ یہ بشارت ہوئی ہے میرے اللہ لوک کو۔ آج جمعے کی نماز کے بعد ایک اور طوفان نوح آئے گا اور کل جہان اس میں ڈوب جائے گا۔ کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ شہرے تو میرے ساتھ چل میرے اللہ لوک کے ڈیرے پر۔ تو بھی بچ جائے گا اللہ کے فضل سے۔“

اسے ناراض نظروں سے دیکھا اور پھر ”چل وچھیرے“ کہہ کر بڑے جوہڑ اور سانسویوں کی ٹھنڈی سے پار ہو کر کھیتوں میں او جھل ہو گئے۔

ڈیرے پر.. لانی چارپائی پر.. گوٹھ مارے.. خاور حساب کے سوال حل کرنے کی کوشش میں جتا رہا۔ لیکن ہند سے سمجھ میں نہیں آتے تھے آگے پیچھے ہو جاتے تھے جیسے تنکے ہوں اور ان کے پاس پانی آگیا ہو اور وہ تیرنے لگے ہوں.. اس کا اندر بے چینی اور تشویش میں ڈوبا ہوا تھا.. اسے اس خیال نے بھی پریشان کیا کہ شہر میں اس کے ابا جان بھی ڈوب جائیں گے.. میں ان کو اطلاع کیسے کروں.. ڈاک کا لفافہ بھی نہیں ہے اور خط دیر سے پہنچے گا تب پہنچے گا جب وہ ڈوب چکے ہوں گے..

وہ ہول جو رسول پور کی ویرانی اس میں بھرتی تھی دوپہر کے بعد.. جمعے کی نماز کے بعد.. دو چند ہوا.. ناقابل برداشت ہونے لگا.. وہ چارے اور گنے کے کھیتوں کو ایک سحر زدہ حالت میں نکلتا رہا.. ذرا کوئی آواز آتی تو اسے اس میں پانی کی ٹوکری سنائی دیتی تھی.. اسے پکا یقین ہو چلا تھا کہ بس اب وہ وقت ہے جب گنے کی گھنی فصل میں سے پانی کا ایک ریلا نمودار ہو گا.. وہ اتنا بلند ہو گا کہ شیشم کے یہ پانچ درخت اس میں ڈوب جائیں گے.. جس چارپائی پر وہ بیٹھا ہے وہ پانی کے دوش پر اٹھتی ہوئی درختوں کے آخری پتوں کی بلندی پر پہنچ جائے گی اور پھر اس کے سمیت وہ ڈوب جائے گا.. اور ڈوبنے سے پہلے اسے آخری خیال یہ آئے گا کہ کیا پو آجی نے جہاز میں اپنے گدھے کو بھی بٹھایا ہے یا اسے پیچھے چھوڑ گئے ہیں..

لیکن کچھ بھی نہ ہوا.. سوائے اس کے کہ چٹکبرا بولی بہت دیر تک بھونکتا رہا.. شام ڈھلی تو وہ جوہڑ کے کنارے کیکر کے ٹنڈ پر جا بیٹھا.. رات ہو گئی.. رات بہت ہو گئی.. پھر سانسویوں کی ٹھنڈی کے کتے بھونکے.. خاور نے انہیں الگ الگ سنا.. لیکن اس میں چٹکبرا بولی کے بھونکنے کی آواز شامل نہ تھی..

گھپ اندھیرے میں ٹراتے مینڈکوں اور ٹھل مچاتے جھینگروں میں.. وہ کان لگائے بیٹھا رہا کہ ابھی ”اول حمد الہی کرے.. سنائی دے گی.. کچھ بھی سنائی نہ دیا.. چند لمحوں بعد اسے گدھے کے کان دکھائی دیے..

پھر پو آجی..

لیکن وہ سر جھکائے چپ بیٹھے گدھے کی حرکت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہلتے چلے آ

پو آجی اسے پہلے بتا تو چکے تھے کہ ایسا ہونے والا ہے لیکن اس نے یقین نہیں کیا تھا.. چاچا ماسٹر اپنے ابا جی کو بہتر ہی جانتے ہوں گے اور شاید وہ تھوڑے بہت عمر کی وجہ سے شیدائی ہو گئے ہوں تو اس نے یقین نہیں کیا تھا لیکن اب معاملہ سنجیدہ لگتا تھا.. اس گاؤں کی ویرانی اور نامرادی نے اسے پہلے سے ہی ہول میں مبتلا کر رکھا تھا اب یہ حتمی خبر سن کر اس کے بدن میں ایک عجیب سنسنہٹ سی رہنمائی جیسے بڑے بڑے سیاہ چوڑے اسے چٹ گئے ہوں اور کانٹے کو ہوں..

”کیسے بچ جاؤں گا پو آجی؟“

”صرف وہ لوگ بچ جائیں گے جو اللہ لوک کو مانتے ہیں اور میں تمہیں ساتھ لے

جاؤں گا..“

روشنی کی پہلی کرنوں نے اپنے جھٹے کا مخصوص پیوند نہر کے پانی سے الگ کیا اور وہ

لٹکنے لگا..

”پر کیسے بچ جائیں گے پو آجی..“

”حضرت نوح علیہ السلام نے تو کشتی بنائی تھی ناں کیونکہ سیلاب نے آخر کار اتر جانا تھا.. جمعے والے سیلاب نے اترنا نہیں اس لیے میرے اللہ لوک کے ترکھان مریدوں نے لکڑی کا ایک ہوائی جہاز بنایا ہے.. آج جمعہ کی نماز کے بعد ہم سب اس میں بیٹھ جائیں گے.. پھر طوفان آئے گا.. سب کچھ غرق ہو جائے گا لیکن وہ جہاز جس میں ہم سوار ہوں گے پہلے پانیوں پر تیرے گا پھر اڑ جائے گا.. اور صرف ہم بچ جائیں گے کل خدا کی میں سے..“

”وہ جہاز کہاں جائے گا پو آجی..“

”یہ مجھے نہیں پتہ.. پر یہ پتہ ہے کہ اس روئے زمین پر صرف ہم ہوں گے جو زندہ بچ جائیں گے.. باقی سب ڈوب جائیں گے.. تو میرے ساتھ چل شہریئے..“

”ماسٹر صاحب..“

”تو پھر نہ جا..“ وہ جلال میں آگئے ”آنکھیں سرخ ہو گئیں“ ”ڈوب جا طوفان نوح

میں.. اپنے ماسٹر سمیت.. نہ جا..“

وہ منہ پھیر کر گدھے کو کنگھی کرنے لگے.. اس سے روٹھ گئے..

اس روز بھی انہوں نے اپنی آنکھوں میں خوب سلائیاں بھر بھر کر سرمہ ڈالا.. عطر پھیل کی پوری شیشی انڈیلی نیا تہ بند باندھا اور گدھے پر سوار ہو کر جانے سے پہلے صرف

رہے تھے۔ آج وہ حضرت عیسیٰ کے روپ میں نظر نہیں آرہے تھے۔

”پو آجی..“ وہ کود کر نیچے آیا۔ لیکن انہوں نے گدھے کا روکا نہیں، روک کر اسے اپنی گود میں نہیں بٹھایا۔ اس کی جانب نگاہ بھی نہیں کی۔ اسی طرح آہستہ آہستہ گدھے کی حرکت کے ساتھ ہلتے ہلتے اندھیرے میں چلے گئے۔

تین روز بعد پو آجی مر گئے۔

ان کی قبر پر جب مٹی ڈالی جارہی تھی تو اس میں بڑے بڑے مکوڑے سیاہ مرچوں کی طرح ملے ہوئے تھے۔ گدال پر جتنی مٹی ہوتی تھی اتنے ہی مکوڑے اس میں کھلاتے تھے۔ قبر تیار ہو گئی تو وہ مٹی میں جذب ہوتے گئے۔ پو آجی کا بدن تو بہت لشکیلا اور ملائم ہے اسے یہ کیسے کاٹیں گے۔ دو ماہ بعد جب اس کی ورینکلر فاسٹل کی قید ختم ہوئی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا اختتام ہونے کو آیا تو چاچا ماسٹر نے ایک مقامی کمہار کے سر پر اس کا سیاہ سوٹ کیس رکھ دیا جس کی تہہ میں بچھا انبار بھورا ہو چکا تھا اور اس میں بسنوں کا ایک خالی بچہ تھا۔ رات ہدایت کی کہ چھوٹے شاہ صاحب کو منکھوال جا کر بس پر بٹھا دے۔ اگرچہ یہ بھی ایک ویران اور نادار دوپہر تھی لیکن وہ اپنے شہر... اپنے گھر جانے کے چاؤ میں کمہار کے پیچھے پیچھے ایک منڈے کی طرح پھدکتا چلا جا رہا تھا۔

آنحضرت کو س کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پگڈنڈی کے دائیں طرف وسیع کلرز دہ ویرانے میں ایک کچی محراب کے آثار دکھائی دیئے جس کے برابر میں مٹی اور گارے سے بنی ہوئی دو کوٹھڑیوں کی چند دیواریں تھیں۔ چھتیں بھادوں کی بارشوں سے ڈھس چکی تھیں اور ان سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر کلر سے سفید ہوتی۔ چڑیوں سے بھری پیاسی زمین پر ایک عجیب بے ہنگم سی شے کھڑی تھی۔ شیشم کے تنے کو کھود کر ایک کھڑکی سی بنا کر اس کے آگے دو تختے یوں ٹھونکے گئے تھے کہ وہ ایک صلیب کی صورت نظر آتے تھے۔

سوٹ کیس بردار کمہار رک گیا ”شاہ جی خیر سے یہی وہ جہاز ہے جس میں سوار ہو کر اللہ لوک کے مریدوں نے اڑ جانا تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد اس میں بیٹھ گئے کہ ابھی آیا سیلاب اور شام تک مغرب کی نماز تک بیٹھے رہے پگڑیاں گھنٹوں کے گرد لپیٹ کر.. پاگل کے بچے.. بھلا لکڑی کا جہاز بھی اڑ سکتا ہے۔“

لکڑی کا جہاز اڑ رہا تھا سندھ کے پانیوں پر جو آسمان تھا جسے ابھی ابھی ایک مہراب

نے خالی کیا تھا لکڑی کا ایک جہاز اڑ رہا تھا۔

اور پو آجی اُس میں اپنے مکھن ملائم بدن کے ساتھ گھٹنے جوڑے انہیں اپنی سفید پگڑی سے باندھے بیٹھے تھے۔ ان کی سفید لٹیں اس آہستگی کے ساتھ جس آہستگی کے ساتھ جہاز جا رہا تھا ہو امیں اٹھتی تھیں اور جب ان پر ڈھلتے سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو نیلے آسمان کے پانیوں میں جیسے ایک چمکیلا پیوند نمودار ہو جاتا تھا۔

لکڑی کا جہاز سندھ کے ریتلے ناپو کے اوپر سے گذر رہا تھا۔ اور پو آجی جیسے سنگ مرمر کا ایک مجسمہ ہوں۔ حنوط ہو گئے ہوں۔ ایسے بے حس و حرکت.. سکوت میں بیٹھے تھے اور نیچے نہ دیکھتے تھے۔ نیچے اُن کا شہر یا بھی لکڑی کے ایک جہاز میں سوار تھا۔ عمر، محبت اور بے گھری کے طوفانِ نوح سے بچنے کے لئے.. اس کے ماضی میں جتنے بھی چستکبرے بولی تھے اُن سے پیچھا چھڑا کر وہ اس جہاز میں آ بیٹھا تھا۔

لیکن پو آجی تو نیچے دیکھتے نہ تھے۔

چائے کا آخری گھونٹ ٹھنڈا رہ گیا تھا۔

سرور آنکھیں ملتا.. اوپر سورج کے ڈھلنے کا اندازہ لگاتا کشتی سے باہر آ گیا۔

”سائیں رات کرنے کے لئے ڈیرہ ادھر ڈالیں گے یا تھوڑا آگے چلیں۔“

”آگے چلیں۔“ خاور نے تادیر بیٹھے رہنے سے ریت میں دھنسنے وجود کو سنبھالا اور اٹھ کھڑا ہوا ”ادھر تو اوپر سے جہاز گذرتے ہیں سرور.. آگے چلیں“

”جہاز سائیں؟“

”ہاں..“ اس نے سر اٹھا کر پھر اوپر دیکھا.. لکڑی کا جہاز اب بھی خالی آسمان میں سنستی سے اڑتا تھا اور پو آجی کے لمبے بال نیلاہٹ کے پس منظر میں سفید لہروں کی مانند آہستگی سے حرکت کرتے تھے ”اوپر دیکھو..“

سرور نے آنکھوں کے سامنے ہتھیلی جما کر اوپر دیکھا نظروں سے آسمان کھنگالا ”اوپر تو سائیں ایک دریائی عقاب اڑتا ہے جس کی چونچ میں ایک بہت بھاری مچھلی ہے.. جہاز نہیں.. جہاز بھلا چونچ میں مچھلی دبوچ کر اڑتا ہے.. دھوپ میں پوری دوپہر بیٹھے رہے ہو تو اس کا کچھ اثر ہو گیا ہے سائیں.. آگے چلتے ہیں..“

جعفر کی انگلیاں سندھ کے سینے میں اترتے بانس پر سیاہ کیکڑوں کی طرح پوسست تھیں اس سے چمٹی ہوئی تھیں جو نکوں کی مانند.. بانس دریا کی تہہ میں ٹھوکر کھا کر مضبوط ہو کر سیدھا ہوتا تھا اور جعفر کے جنور بچے کے زور سے کشتی آگے آگے جاتی چلی جاتی تھی۔

ایک اور شام تھی..

بارہ کہو کی پہاڑیوں پر بھی ایک اور اترتی شام تھی..
بڑے پتھر کی کھوہ میں اس کے لئے چکن سینڈویچ اور مشروب تھے اور غلافی آنکھیں اس شام کو اپنے اندر جذب کر کے سپال ہوتی تھیں..
کھڑکی کی چوکھٹ پر انکا سورج ساتوں آئینوں میں اترتی شام کی خبر کرتا تھا۔
بہت سی شاہیں گزر چکی تھیں لیکن یہ ایک اور شام تھی..
وہ نہر کنارے گھاس اور تریل کی ٹھنڈک میں اونگھ گیا تھا اور سویر کی بجائے شام آ گئی تھی..

اس نے کہنیاں نکا کر اپنے آپ کو اونچا کیا جیسے ”اول حمد خداوی کرے..“ کہیں سے سنائی دیا ہو اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا.. جعفر کے پاؤں مسلسل کناروں پر حرکت کرتے تھے اور ان سے پرے سندھ ایک سرمئی سپاٹ صحرا کی مانند خاموشی میں تھا.. تھا ہوا اور سانس روکے ہوئے تھا..

اس نے چوٹی پلیٹ فارم پر تب ہاتھ رکھا جب جعفر کے پاؤں اس پر سے گزر گئے.. جب واپس آئے تو اس کے ہاتھ کو راستے میں پڑا دیکھا تو وہ رک گیا ”باہر آؤ گے سائیں؟“
”ہاں..“

”تو آؤ..“ جعفر کا ہاتھ نیچے آیا.. جسے تمام کر اس نے پلیٹ فارم پر ایک پاؤں جمایا اور پھر زور لگا کر باہر عرشے پر آگیا.. باہر منظر ہی الگ تھے.. ٹھہرے ہوئے سحر سے پھونکے ہوئے.. وہ کشی کی نوک سے ذرا الگ جہاں جعفر کا جال پڑا تھا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر مسافت کی ہوا پھیلنے لگی..

ہر شے ہر وجود ایک خلائی سکون میں خاموشی سے بہتے جا رہے تھے۔ چپ اور

شام ہونے لگی..

ایک اور شام ہونے لگی..

اس کے سلیپنگ بیگ میں ایک عجیب ناگوار سی گیلی مہک تھی.. پکھتی اس پر لیٹی رہی تھی.. دوپاؤں جو جعفر کے تھے کشتی کے چوڑے کنارے پر دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔
کشتی بے آواز تیرتی تھی..

سلیپنگ بیگ پر لیٹا خاور ابھی تک پو آجی کے لکڑی کے جہاز کو دیکھتا تھا.. وہ تنہا بیٹھے تھے ان کے ہمراہ نہ اللہ لوک تھا اور نہ کوئی مرید.. وہ بالکل اکیلے تھے.. اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے گدھے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے.. اگر اس روز وہ ان کا کہا مان لیتا ان کے ساتھ چلا جاتا تو وہ بھی آج ان کے ساتھ بیٹھا ہوتا.. اسے ایک اپنا جہاز بنانے کے حاجت پیش نہ آتی.. وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو وہ انہیں ہاتھ ہلا کر کہتا.. پو آجی میں یہاں ہوں.. انہیں خبردار کرتا کہ سیاہ موٹے مکوڑے مٹی میں جذب ہو کر ان کے ریشمی بدن کو کھانے کے لئے آنے والے ہیں.. لیکن وہ نیچے نہیں دیکھتے تھے.. وہ اپنے گدھے کے پیچھے چھوڑ آئے تھے.. خاور مسکرانے لگا..

باہر کشتی کے کنارے پر جعفر کے دوپاؤں دوڑتے نظر آتے تھے.. یقیناً ان کے اوپر ماماں جعفر کا سیاہ دھڑ بھی تھا.. آسانی سے گنی جا سکنے والی مہین پسلیاں بھی تھیں.. چمکتی بوٹی بھری آنکھیں اور وہ لنگی بھی تھی جو اس کے درمیانی وجود کو چھپاتی نہ تھی کہ وہ ایک قدیم منہ زور جنور کا بدن تھا جو چھپ نہیں سکتا تھا.. اور اسے چھپانے کی سعی کرتی ایک لنگی بے سود ٹھہرتی تھی..

گنگ.. جیسے وہ کسی ایسے سیارے میں اتر رہے ہوں جہاں ہوا کا ایک سانس بھی نہیں تھا۔ جنگل نیلے.. دور کنارے.. سروٹ اور بلند گھاس.. پانیوں کی ٹکڑیوں کا ایک سرمئی آہستگی کے سفر میں ایک ہو رہے تھے..

وہ بھول چکے تھے کہ رات کے پڑاؤ کے لیے کسی مناسب ٹاپو یا جزیرے کو ابھی تلاش کرنا ہے اور اس بے آواز خلا میں دم رو کے بہتے جا رہے تھے.. کشتی جس منظر کو خالی کر کے آگے بڑھتی تھی پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ بھی اس سرمئی سناٹے میں گم ہو رہا تھا۔ لیکن شام جو اترتی تھی اس میں دائیں جانب 'سندھ' کے پھیلاؤ اور ریتلے کناروں کی وسعت کے پار.. بہت طویل فاصلوں پر.. شاید سینکڑوں کوس کے فاصلے پر جو منظر تھا وہ اس سرمئی سناٹے سے بالکل جدا تھا.. وہاں بہت دور ایک سپاٹ افق تھا جہاں سورج مدہم ہو کر بجھتا ہوا نیچے جا رہا تھا.. اور ایک وسیع پھیلاؤ والے تنہا بادل کے سیاہ جال کے اندر اترتا نظر آ رہا تھا.. اس کے زوال کی مدہم روشنیاں پھیل کر جال میں سے فرار ہو کر باہر نکلتے ہی دم توڑتی تھیں.. کوئی ایک لمحہ آیا جب غروب کے اس پس منظر میں سے کوہ سلمان کے دور افتادہ سیاہ کوبان نما پہاڑ اور بلندیاں جیسے غیب سے ظاہر ہونے لگے.. فنا سے وجود میں آنے لگے.. دکھائی دیئے گئے.. ابھی وہ مقام خالی اور تاریک تھا لیکن غروب کی کرنوں کا کوئی بھولا بھلا زاویہ ان پر ایسے وارد ہوا کہ کوہ سلمان سمندر میں سے یکدم ابھرنے والے بے نام جزیروں کی طرح افق پر جگہ جگہ ظاہر ہونے لگا.. صرف ایک وسیع بادل تھا جس نے ڈوبتے سورج کو اپنے جال میں روپوش کر رکھا تھا اور اس بادل کے کونوں کھدروں میں سے فرار ہونے والی ہلکی زرد.. پتھلتے سونے کی رنگت ایسی روشنی اس پہاڑی سلسلے کے سیاہ کوبانوں کو افق پر نمایاں کر رہی تھی.. یہ کوئی ایسا بالی جزیرہ دکھائی دے رہا تھا جو بحر الکاہل میں قرونوں سے..... بھوکے پیاسے مذہال آوارہ گرد ملاح کو یکدم سمندر پر معلق گہری دھند میں سے جھٹک دکھلاتا ہے اور وہ "بالی ہائے.. بالی ہائے" پکارا اٹھتا ہے..

یہ کسی لاکھوں برس پیشتر کے گم شدہ عہد کی تصویر تھی..

ابھی انسان نے اس زمین کو آلودہ نہیں کیا تھا اور منظر بے جھجک تھے..

یہ کسی کوہ طور کا سلسلہ تھا جو ایک مجہزے کی طرح عارضی طور پر یکدم وجود میں

آگیا تھا.. جھاڑی کے اندر سے نور کی جن شعاعوں نے موسے سے کلام کیا تھا بس وہی اس سیاہ

بادل میں سے پھوٹتی تھیں..

اس سحر افروز منظر کا اظہار حیرت کے سوا بھی ہونا چاہیے.. حیرت کے سوا اظہار کا واحد ذریعہ حواس کو تیاگ دینا ہے.. ایسے کہ انسان اس انہونے ظلم کو دیکھ کر پانی میں چھلانگ لگا دے.. اور ڈوب جائے.. نہ ڈوبے تو ابھر کر ایک ڈولفن کی طرح سیٹیاں بجانے لگے اور یوں اپنی مسرت کا اظہار کرے.. یا بہاؤ میں تیرتی کسی مچھلی کی دم پکڑ کر کوئی فلمی گیت گانے لگے.. یا پھر اتنا تو کرے کہ جعفر یا سرور کو دبوچ کر انہیں چومنے لگے.. حیرت کے سوا کچھ اور کرے.. اور چونکہ وہ کچھ اور نہیں کر سکتا تھا اس لیے ذہنی طور پر پسماندہ ایک بچے کی مانند منہ کھولے 'ہوٹ ڈھیلے چھوڑے' ایسے کہ اس کے ہونٹوں کے کونوں سے لعاب بہہ کر اس کے رخساروں پر اترتا ہو اور وہ بے خبر رہے.. وہ اس منظر کو تکتا رہا.. سکوت کی ٹھنڈک میں سکڑتا رہا اور اس کی ریزہ کی ہڈی میں اس منظر کی بے یقینی ایک سرد لہر کی طرح ٹھنڈی سرایت کرتی رہی اور وہ منہ کھولے اسے دیکھتا رہا..

سیاہ جال میں اترتا ہوا سورج اسی حجاب میں پوشیدہ کوہ سلمان میں اتر گیا اور پھر نہ پری رہی.. رہی تو بے خبری رہی..
ماماں جعفر اس سے بے خبر کشتی کے کنارے پر دوڑتا.. بانس کو پانیوں میں اتارتا
اس شام میں اترتا تھا..

کشتی کی روانی میں رکاوٹ کے آثار دھچکوں کی صورت میں ظاہر ہونے لگے..

کنارے کی قربت سے اس کا نچلا دھڑتہ کی ریت میں دھنستا تھا..
دونوں پاؤں جب آگے پیچھے حرکت کرتے.. ایک مرتبہ پھر کشتی کے پچھلے حصے تک گئے تو پھر اطمینان میں چلتے ہوئے واپس آئے اور عرشے پر ساکت ہو گئے.. جعفر نے بانس کو پانی میں سے نکالا اور خاموش کھڑا ہو گیا.. کشتی خود بخود کنارے سے لگنے لگی.. اس نے بالآخر ایک ہو کا سا بھر اور رک گئی..

تمام بغضیں پانی کی.. روانی اور بہاؤ کی تھم گئیں..

"ادھر پڑاؤ کریں گے سائیں.. جعفر نے فیصلہ کن انداز میں اسے اطلاع دے دی.. وہ آلتی پالتی مارے بہت دیر تک بیٹھا رہا تھا اس لیے جب اٹھا تو اس کے گھٹنوں میں درد کی ایک سرسراہٹ سی ہوئی.. کمر پر ایک بوجھ سا بھاری ہوا.. اور وہ ایک ہاتھ دائیں گھٹنے پر

جما کر اور دوسرے سے اپنی بو جھل کر کو سہار کر اٹھا اور جعفر جو کشتی رکھتے ہی ایک مینڈک کی طرح اچھل کر کنارے پر جا چکا تھا اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ جعفر نے اس کے ہاتھ کو اپنے سکرے ہوئے مینڈک پنچے میں جکڑا اور وہ گر تاپڑا کنارے کی ریت پر آگرا۔

”سامان اتاریں گے سائیں۔“ جعفر نے پوچھا۔

کوہ سلمان کا بالی جزیرہ نیم تاریکی میں غرق ہو چکا تھا۔ سمندر میں پھر سے ردپوش ہو چکا تھا اور اب وہاں ایک سپاٹ اور چند لٹکوں میں مکمل تاریکی میں اتر جانے والا ایک سپاٹ اور بے روح افق تھا۔ خاور کے سامنے ایک وسیع ریتلا علاقہ اگرچہ سندھ کی مختلف شاخوں میں گھرا ہوا تھا لیکن ایک بے آباد صحرا کی طرح حد نظر تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے پار پانیوں کی کوئی لکیر نظر نہ آتی تھی۔ دریا کے کوئی آثار نہ تھے۔ ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اور بے نام سے بونے تھے اور ان درختوں کی سوکھی ہوئی ٹہنیاں اور تنے ابھرتے تھے جو پانی میں بہتے ہوئے آئے اور کناروں کے ساتھ لگ کر پانی کے اترنے سے دریا سے دور صحرا میں کھو گئے۔

وہ کشتی سے منہ موڑ کر شام کے اس بے انت صحرا میں چلنے لگا جس میں ایک عجیب سی کشش اور انجانے بلاوے تھے۔

اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس کی کشتی کس مقام پر آکر رکی ہے۔ وہ ریت میں سے پاؤں اکھاڑتا اپنی کمر پر ہاتھ رکھے۔ گھٹنوں کے درد کی یکدم واپسی کے لیے تیار۔ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ اور جب اس نے آخر کار مڑ کر دیکھا تو کشتی کسی ریتلے ابھار کے پیچھے ردپوش ہو چکی تھی۔

یہ فرار ہی اس کے روگ کا علاج تھا۔

یہی اس کے اندر کی تمنا تھی۔

کم از کم اس ریتلی تنہائی میں اس ایک اور شام میں۔ بل ڈوزر کی مہیب گڑگڑاہٹ داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے ایک عفریت کی مانند منہ کھولے بلیڈ اس کے کتب خانے کو مستودوں اور نایاب تصاویر کو۔ اس کی رائٹنگ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو۔ اس کے نو تھ برش اور آفٹر شیو لوشن کو۔ ہینر کلر کی ٹیوب اور ریزر کو۔ نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی حیاتی کو مسمار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یہاں محفوظ تھا۔ ایک ایسے گھر میں تھا جسے کوئی نہیں گرا سکتا تھا۔

یہاں وہ غلامی آنکھوں کی کوٹھڑی کی قید میں بھی نہ تھا۔

اسے عابدہ سومرو کے بدن کے نیلے دھبے اور کھرینڈ بھی نہیں ستاتے تھے۔ بس وہ تھا۔ اور قدموں تلے کھسکتی ریت اور چپ تھی۔ ایک اور شام تھی اور ریتلے ابھار کے عقب میں کسی کشتی کا وجود نہ تھا۔

ٹنن ٹنن ٹنن۔

جو خاموشی تھی اس میں سے گھنٹیوں کی آوازیں تیرتی۔ انکئی۔ اس کے کانوں تک آئیں۔ وہ رک گیا۔

جو نبضیں تھم چکی تھیں۔ ان کی مردہ خاموشی میں سندھ کے جو پانی نظر نہیں آتے تھے ان پر سفر کرتیں وہ آوازیں آنے لگیں۔

گھنٹیوں کا ایک مترنم آر کسٹرا تھا جو ریت کے ہر ذرے میں کھنکنے لگا۔

ٹنن۔ ٹنن۔ ٹنن۔

ہر گھنٹی کی ٹنن سے ایک مندر ٹاپو کی ریت پر ابھرتا تھا۔

یہ آوازیں اتنی بلند تھیں کہ افق میں ردپوش ہو چکے کوہ سلمان کے کنٹروں پر دستک دیتی تھیں اور اتنی بدم اور سریلی بھی تھیں کہ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی تھیں اور اتنی پر تاثیر تھیں کہ سندھ کے پانیوں کی گہرائی میں جتنی مچھلیاں تھیں ان کے گھلپھڑوں پر اثر کرتی تھیں اور ہر اس اندھی ڈولفن کو جو پانیوں کے اندر تھی یا ان کے باہر سانس لینے کو آتی تھی اسے اپنے ترنم سے مینائی دیتی تھیں۔

یہی کل کائنات تھی۔

جس کائنات میں وہ تھا۔ ریت کے وسیع علاقے میں۔ ایک دشت کے پھیلاؤ میں۔ جہاں سبز گھاس کے چھدرے تنکے کہیں کہیں نمودار ہو کر سر اٹھاتے تھے۔ اس کے قدم ریت میں دھنستے تو کتنے تنکے اس کے جاگرتے آکر ریت میں دب جاتے۔

اس کل کائنات میں گھنٹیوں کی سریلی صدا میں گونج رہی تھیں۔

سب کے سب مندر ویران پڑے تھے اور ان کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور صرف وہ ایک بچاری تھا جو انہیں سن رہا تھا۔

سریلی صداؤں کی گونج آنکھوں سے او جھل پانیوں پر سے گزرتے ہوئے دوچند ہوتی۔ ریت کے بے انت پھیلاؤ پر پھیلتی اور اسے مسخر کرتی تھی۔

اس ناپو کے پار جس کے پیچھے وہ روپوش ہو گئی تھی وہ گئے تو کشتی ایک کھلونے کی طرح ریت میں رکی ہوئی نظر آنے لگی۔ جیسے کوئی جہاز مدوجذر کے زور سے خشکی پر آگیا ہو اور پانی سٹ کر واپس چلے گئے ہوں۔ ایسے وہ ایک طویل فاصلے سے۔۔ یہاں سے دکھائی دی۔۔ اوڈیسس کی کشتی کے روپ میں۔۔ سنہری کھال کی تلاش میں سرگرداں سحر طراز سمندوروں میں نہیں۔۔ لیکن خاور اوڈیسس کی ماند با مقصد اور پختہ اروہ رکھنے والا شخص نہیں تھا۔۔ وہ کسی سنہری کھال کی تلاش میں نہیں تھا۔۔ یہ ایک بے وجہ بے جواز اور بے مقصد سفر تھا۔۔

”پھر سائیں آپ حکم کرو۔۔“

”ٹھیک ہے رات ادھر کریں گے۔۔ تم جا کر سامان نکالو۔۔ میں آ جاؤں گا۔۔“

جعفر کے چہرے پر اطمینان آگیا ”جا کر نکالتا ہوں سائیں۔۔ سرور کو بولتا ہوں کہ آپ کا تنہو لگائے۔۔ اور فہیم کو کہتا ہوں کہ کھانے کی دیکھی چیز کھائے۔۔ آپ آرام سے آجانا“

وہ پلٹا اور ریت کو روندتا اس پر ایک سنگ مرمر کے فرش کی طرح چمکا کشتی کی جانب چلنے لگا۔

ریتیلی کائنات مکمل سنانے میں چلی گئی جس میں صرف اس کا سانس چلتا تھا۔۔ یہ تنہائی اتنی بڑی تھی کہ وہ اسے سنبھال نہیں سکتا تھا۔

ٹبل ڈوڑر کے بلیڈ نے صرف اس کتابوں اور ٹوتھ برش اور لیپ کو ہی نہیں اس کی زندگی کو بھی اور اسے بھی مسمار کر دیا تھا۔۔

دور ریت کی ایک طویل مسافت کے پار کھلوناد کھائی دیتی بڑی تنہائی میں چھوٹی سی کشتی میں سے سرور اور جعفر اس کا سامان نکال کر کنارے کی ریت پر ڈھیر کر رہے تھے۔۔ اور وہ اتنی دور تھے کہ مکوڑے سے لگتے تھے جو رنگ رہے تھے۔۔ کشی کے کھلونے میں سے دو بونے نکلتے تھے اور کنارے پر جھک کر واپس چلے جاتے تھے۔۔

ابھی کچھ روشنی تھی۔

وہ بہت دور۔۔ بُت بنا بغیر کسی احساس کے۔۔ مقصد کے۔۔ وہاں اس سنانے کی کوکھ میں کھڑا رہا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ دو بونے اب کشتی کے اندر واپس نہیں جاتے۔۔ مکوڑے اس کے آس پاس رنگ رہے ہیں تو وہ ان کی جانب چلنے کو تھا کہ اس کے کانوں میں نامانوس سی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ آسمان سے اترنے لگیں۔۔ بہاؤ کی ہلکی سرسراہٹ اور ہوا کی نامعلوم مسافت پر حاوی ہوتی۔۔ جیسے کہیں بہت سارے کوئے بولتے ہوں۔۔ اس نے سر اٹھا کر نظروں

یہ جو اس کو مکمل طور پر کھودینے کی دلیل تھی۔۔ ورنہ غازی گھاٹ سے طویل آبی مسافتوں پر۔۔ سندھ کے کسی بے نام جزیرے کی شام میں۔۔ وہ کونسا موزارت تھا جو پیاو بجارہا تھا۔۔ کون پتھوون تھا جو مون لائٹ سنانا کی دھن چھیڑ رہا تھا اور کیسا خورشید انور تھا جو ”گھوٹگھٹ“ کی آسیب زدہ گھنٹیاں کمپوز کرتا تھا۔۔ کوئی نہ جانے کب آئے۔۔ جنم جنم کی پیاس بجھائے۔۔ کوئی آئے۔۔

جعفر اس کے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔۔ اور وہ بے خبر رہا تھا۔۔ اس کے سیاہ پاؤں ریت میں دھنستے نہ تھے وہ ایسے چلتا آتا تھا جیسے اس کے قدموں تلے ایک فرش مائل ہو۔

نم آلود شام کی ہوا میں اس نے اس کے قریب پہنچ کر ایک گہرا سانس لیا۔

”سائیں سندھ کے کناروں پر۔۔ شام ڈھلتی ہے تو مویشی پانی پینے کے لیے اترتے ہیں۔ تو ان کے گلے میں بندھی گھنٹیاں پانیوں پر تیرتی ہیں۔ دور تک جاتی ہیں آپ سنتے ہو سائیں۔“

”ہاں جعفر۔۔ میں سنتا ہوں۔“

”شام ہوتی ہے ناں سائیں۔۔ تو ادھر جو دھن وال ہیں ان کے کچے ڈیروں میں سے مویشی چلتے ہیں اور دریا کے کناروں تک آتے ہیں تو یہ ان کا بلاوا ہے۔۔ سنتے ہو سائیں؟“

”ہاں۔۔“

”یہاں سے تو کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔۔ مویشی دور ہیں اور او جھل ہیں۔۔ پر گھنٹیوں کا بلاوا۔۔ پانی پر چلتا آتا ہے تو نزدیک لگتے ہیں پر بہت دور ہیں۔۔“

وہ کان لگائے دھیان لگائے سنتا رہا۔۔ سندھ کے مندر میں لگا تار گھنٹیاں بجتی تھیں۔۔ ان میں کیسیائیوں کی گھڑیاں گونجن نہ تھی بلکہ ایک آہستہ اور نسوانی ترنم تھا۔۔ پھر ان کے مدھر پن اور آوازوں کی مدت میں وقفہ آنے لگا۔۔ ترنم اب اٹک رہا تھا۔۔ رک رک کر آتا تھا۔۔ وقفے کی مدت طویل ہونے لگی اور بہت دیر بعد کسی ایک گھنٹی کی آواز آ جاتی جیسے اسے خاموش رہتے ہوئے یکدم خیال آگیا ہو کہ اس نے دریا پار کسی منتظر کان کو ایک آخری سندسہ بھیجنا ہے۔۔ گھنٹیوں کی اس ہمنوا بجانے والے سازندوں نے اپنے ساز رکھ دیئے تھے۔۔ سندھ کی نبض پھر سے ختم گئی۔۔ سنانے کو واپس آنے میں کچھ دیر لگی اور جب وہ اس کے آس پاس پھر سے اتر گیا تو بہاؤ کی مدھم نے سنانی دینے لگی۔۔

”مویشی پانی پی کر اپنے بازے کو لوٹ گئے ہیں سائیں۔۔ رات ادھر کریں گے ناں سائیں؟“

سے بڑی تہائی والے بڑے آسمان کی خالی وسعت کو کھنگالایہ تعین کرنے کے لئے کہ یہ آوازیں کدھر سے اتر رہی ہیں۔ ان کا منہ کہاں ہے۔ جنوب کی جانب۔ ابھی کچھ روشنی تھی اگرچہ شام کا غلبہ مکمل ہونے کو تھا۔ جنوب کے آسمان پر اس کے خالی پن اور سپاٹ وجود میں ایک سیاہی سی تیرتی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ بلندی کو کم کرتی نیچے آتی تھی اور جب اس کے نقش واضح ہوتے تو سیاہی کی وہ کثیر ٹوٹنے لگی اور چھوٹے چھوٹے سیاہ دھاگوں میں بٹنے لگی۔ پھر ان دھاگوں کو پڑ گئے اور وہ الگ الگ اڑتے دکھائی دینے لگے۔ پرندوں کی ایک ڈار تھی۔

نیچے اترتی۔ تیزی سے بلندی کم کرتی۔ کوؤں کی آوازوں میں غل کرتی۔ ریتلے ٹاپو کی جانب چو نہیں نیچے کئے۔

اور صرف وہی ایک ڈار نہ تھی۔

اس کے کچھ فاصلے پر۔ اس کے پیچھے پیچھے پرواز کرتا پروں کا ایک اور ہجوم تھا۔ ایک اور ڈار تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں جانب سے بھی ہزاروں پرندے اس کی پیروی کرتے چلے آتے تھے اور کوؤں کی طرح شور مچاتے آتے تھے۔ وہ بے انت اور بے حساب تھے۔ جو راہنما ڈار تھی وہ نہایت منظم ترتیب سے ایک ہر اول دستے کے طور پر انہیں راستہ دکھا رہی تھی اور سب سے بلند آہنگ اسی کی کانیں کانیں تھیں۔

پہلی ڈار بہت نیچے آگئی۔ اتنی قریب کہ وہ اس میں شامل ایک ایک پرندے کی آنکھ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے پر شمار کر سکتا تھا۔ وہ اتنی قریب آچکی تھی۔ لیکن یکدم ہر پرندہ ٹھٹکا۔ انہوں نے اس کے سر کے عین اوپر آکر اپنی پرواز کا چکر مکمل کیا اور پھر رخ بدل کر شور مچاتے پلٹ گئے اور جس لمحے وہ یکدم پلٹے تو پہلے وہ شام میں نیم سیاہ دکھائی دیتے تھے اور اب پلٹنے سے رخ بدلنے سے وہ غروب کی چند کرنوں کی زد میں آگئے اور ان میں سے ہر پرندے کا وجود سنہری ہو گیا۔ ایک ایک پر سونے میں ڈھل گیا۔

ان کے عقب میں آنے والی ڈار نے جب انہیں ارادہ بدل کر پلٹتے دیکھا تو وہ بھی اپنے پروں کو ترچھا کرنے لگی اور ان پر بھی سونا پچھا اور ہونے لگا۔

وہ دم بخود کھڑا رہا۔ گردن اوپر دیکھتے دیکھتے دکھنے لگی۔ آج تک اس نے اتنے پرندے اتنی بڑی تعداد میں قدرت کے اس نظام میں جو صرف ان کے لئے تخلیق کیا گیا تھا اڑتے ہوئے نہیں دیکھے تھے۔

”سائیں سامان اتر گیا ہے۔ فہم مرغی بھونتا ہے۔“ جعفر اس کی آسمان پر جمی نظروں کے دامن میں چلتا ہوا اس کے پاس آچکا تھا اس لئے وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔

”جعفر نے بھی اس کی نظروں کی پیروی کرتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور وہی دیکھا جو وہ دیکھ رہا تھا اور کہنے لگا۔ ”سائیں منگھ دیکھتے ہو؟“

اس نے سر نیچے کیا تو اس کی گردن ڈبکی۔ اور اسے جعفر سامنے کھڑا نظر آیا ”منگھ؟“

”یہی جو پنکھ پکھیر دیکھتے ہو یہ منگھ ہیں۔ یہ ہمارے سندھ سائیں کی پناہ میں آتے ہیں چار دیہاڑے پالے کے دن کاٹنے۔ یہاں سے بہت آگے جاتے ہیں اور پھر ان دنوں اپنے دیسوں کو لوٹنے کے لیے واپسی کا سفر کرتے ہیں۔ ادھر اس علاقے میں اس ٹاپو پر رات کر کے آگے جاتے ہیں۔ یہ ان کی چراگاہ ہے سائیں۔ یہ گھاس کے تیکے نہیں دیکھتے۔ ان کو چگتے ہیں اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اگلی سویر کوچ کر جاتے ہیں اپنے وطنوں کو۔“

”انہیں آپ منگھ بولتے ہو؟“

”جی سائیں۔ لیکن جو شہر والے ادھر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ہنس ہیں۔“

”ہنس؟“

”ہاں سائیں۔“

”یہ کوؤں کی طرح شور مچا رہے ہیں۔“

”ہاں سائیں شور تو کریں گے ناں غریب پر دیسی۔ آپ اپنے گھر میں کسی غیر کو دیکھو گے تو شور تو مچاؤ گے ناں۔ اچھا تو نہیں لگے گا آپ کو۔ ان کو عادت نہیں ہے ناں کہ سارا دن اڑنے کے بعد رات کرنے کو اپنی چراگاہ کے اوپر آئیں تو اس ویران ٹاپو پر کوئی غیر بندہ بشر کھڑا ہو۔ آپ غیر ہونا سائیں تو یہ غریب شور مچاتے ہیں بے چارے پر دیسی کہ یہ کون ہے اور ہمارے ٹاپو پر کیوں آیا ہے۔“

”تو یہ اب یہاں نہیں اتریں گے؟“

”نہ سائیں۔“

”تو کدھر جائیں گے؟“

”ان کو شور کرنے دو سائیں۔ یہ ابھی تھک ہار کر کہیں اور جا کر رات کر لیں گے۔ ادھر اور بھی جگہیں ہیں۔ میں نے سامان نکال لیا ہے۔“ جعفر ابھی تک پلٹتے اور پھر

واپس آتے ہنسوں کے شور مچاتے ہجوم سے غافل ہو گیا۔ ”فہیم نے چو لہا گرم کر دیا ہے اور ماماں جعفر کہتا ہے کہ آج کی رات میں اپنے صاحب کو اپنی عاشقی معشوقی کے قصے سناؤں گا۔ ماماں جعفر عورتوں کے معاملے میں بڑا کارگر آدمی ہے سائیں۔“

ہنسوں کی ڈاریں اس کے سین اوپر گردش میں تھیں۔ بلبلاتی فریاد کرتی اور اس پر لعنت بھیجتی ذرا نیچے اترتی تھیں اور پھر اوپر ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنی چراگاہ کے تقدس کو پامال کرنے والے پر نفرین بھیجتی تھیں۔ باری باری نیچے آتی تھیں اور کامیں کامیں کا احتیاج بلند کرتی پلٹ کر پھر سے بلند ہو جاتی تھیں۔

ہزاروں ہنس تھے۔ غل کرتے۔ ابھی تک اسی بلندی پر جہاں ان کے پروں پر غروب کی آخری کرنیں پڑتی تھیں اور نیچے ناپو پر نیم تاریکی تھی۔

”تو اب یہ نیچے نہیں اتریں گے؟“

”کون سائیں؟“ جعفر ان کے وجود کو اور شور کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔

”یہی.. منگھ!“

”نہ سائیں.. یہ گھبرا گئے ہیں.. ابھی کسی اور ٹھکانے کی تلاش میں چلے جائیں گے۔“

خاور ابھی تک سیدھا کھڑا انہیں تک رہا تھا۔ اس نے سر جھکا یا اور پلٹ کر کشتی کی طرف چلنے لگا۔ شرمندہ اور خجل۔

”جعفر..“

”جی سائیں..“

”یار تمہیں تھوڑی تکلیف تو ہوگی.. پر آج رات کسی اور ناپو پر جا کرتے ہیں۔ دوسرے کے گھر میں رات کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”پر سائیں.. سامان نکال لیا ہے.. تنبو لگ گیا ہے اور فہیم چو لہا جلاتا ہے۔ منگھ کا کیا ہے.. سندھ میں ڈوبیں گے تو نہیں.. کہیں نہ کہیں جا بئیرا کریں گے۔“ جعفر تھوڑا سا طیش میں تھا لیکن سنبھل کر.. اگرچہ ناگواری چھپا نہیں سکتا تھا.. سنبھل کر کہہ رہا تھا..

”مہربانی ہوگی تمہاری.. کہیں اور چلتے ہیں۔“

اور جب وہ دونوں کشتی تک پہنچے تو وہاں ایک عارضی بستی کو بسانے کے بندوبست ہو چکے تھے.. اس کا خیمہ ریت میں پنچے گاڑے نصب ہو چکا تھا.. فہیم دیکھی میں جھاکتا تھا..

سرور سامان کے اوپر ایک ترپال پھیلا رہا تھا اور کچھ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور تاریکی میں جا رہی تھی..

وہ وسیع ناپو اور چراگاہ جسے وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا اب اس کے غیر وجود سے خالی ہو کر اپنی آبائی ویرانی کو لوٹ گئی تھی.. ایک مختصر سا وقفہ آیا.. بہاؤ کی سرگوشیوں نے چراگاہ کے گرد گردش کی اور پھر وہ اترنے لگے..

ہنسوں کی پہلی ڈار اس کے ایستادہ خیمے اور کشتی سے بہت پرے اس مقام پر جہاں وہ ابھی تھا وہاں اپنی چراگاہ کی ویرانی میں اطمینان سے اترنے لگی.. پروں کا ایک تاریک ہجوم تھا جو آسمان سے نیچے ہو کر ریت پر اترتا تھا.. ایک ایک ہنس الگ الگ اترتا تھا کیونکہ ہر ہنس جب ریت کی قربت میں آتا تھا تو اس پر اترتے ہوئے اس کے پروں اور پنوں کا انداز مختلف ہوتا تھا۔

ان میں سے کوئی ایک ہنس ایسا تھا جس کی آنکھیں غلافی تھیں.. اور آنسوؤں سے لبریز تھیں.. کوئی ایک ہنس ایسا تھا جو قربت مرگ میں اپنا آخری گیت گاتا ہے.. اس کے بدن پر نیلے دھبے اور کھربند تھے اور وہ سات آئینوں میں الگ الگ دکھائی دیتا تھا۔

اور سلطانہ کی نیلی خانہ بدوش آنکھوں والا ہنس بھی شاید انہی میں سے ایک تھا جو ابھی چراگاہ میں اترنے کو تھا۔

بچھے دل سے سرور اور جعفر کنارے پر ڈھیر سامان کو اپنے اوپر بوجھ کر کے واپس کشتی میں لے جا رہے تھے.. فہیم چو لہے پر رکھی گرم دیکھی کو ایک دسترخوان میں لپیٹ کر نہایت ناراضگی سے اٹھا رہا تھا..

خیمہ سب سے آخر میں اکھاڑا گیا.. اور تاریکی بڑھ رہی تھی.. وہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ یہ شخص چند پرندوں کی آہ وزاری کے باعث اس ناپو کو کیوں چھوڑتا ہے.. بستی جو مشکل سے آباد ہوئی تھی اسے اجاڑ دینے کو کیوں کہتا ہے.. پرندے تو شور کرتے رہتے ہیں اور کہیں اور کیوں جاتا ہے رات ہونے والی ہے پانیوں میں بھٹکنے کے لیے کیوں جاتا ہے..

بائیں اٹھاتے ہوئے جعفر نے اگرچہ سرور سے کہا لیکن دراصل خاور سے مخاطب ہوا ”سرور ہوئے.. لائین جلاؤ.. ابھی تو رات کرنے کے لیے کیا معلوم کدھر جانا ہے..“

ہے.. تمہارے اور میرے درمیان یہی رابطہ ہے.. موت کے سوا اور کوئی تعلق نہیں.. مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیوں آجاتی ہے اور کوئی ایک لمحہ کیوں چھٹی ہے آنے کے لیے.. کوئی دوسرا کیوں نہیں.. اور کسی ایک فرد کو کیوں چھٹی ہے.. میں بس یہی جاننے کی آرزو مند ہوں.. شاید تم اس گتھی کو سلجھا سکو.. تم جو مجھے موت کے رسیا لگے ہو..

پرائی آنکھوں سے پوشیدہ مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر جو ایک ندی بہہ رہی ہے اس پر ایک پل ہے جس پر ایک سفید کار کھڑی ہے..

سٹیئرنگ سے اوپر عقبی ٹریفک پر نظر رکھنے والا جو آئینہ ہے اس کے گلے میں موتیے کا بوسیدہ.. اپنے کنوار پن کی سفیدی کھو کر دھندلا جانے والا ایک ہار لنگ رہا ہے جس کی مہک میں ناگواری کا زوال ہے..

پل پر سے مرگلہ کے کسی گاؤں تک جاتی کوئی ویگن کبھی کبھار گزرتی ہے اور سفید کار کو سامنے پا کر ہارن دے کر گزرتی ہے..

کوئی خاندان.. اسلام آباد یا چیر سہاؤے سے لوٹا.. پہاڑی سے اتر کر پل کے پار اپنے گاؤں کو جاتا ہوا..

وہ ویگن اور وہ خاندان دونوں.. ان کی موجودگی سے بے خبر.. وہ جو پل سے ذرا فاصلے پر پانیوں کے قریب ہوئے بیٹھے ہیں.. دور سے یہی لگتا ہے کہ ایک مدت سے ایک دوسرے سے آشنا ہیں.. تنہائی کی چاہت میں ادھر آنکھیں ہیں اور اب جانے کیا راز و نیاز کر رہے ہیں.. لیکن کوئی بھی ان کی طرف دھیان نہیں کرتا تھا.. اسی لیے کوئی بھی اس امر سے آگاہ نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے سراسر اجنبی ہیں اور.. صرف موت ہے جو ان کو یہاں لے آئی ہے..

”مجھے بتاؤ کہ یہ عشق کیا ہے اور مرگ کیا ہے.. ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے.. تمہاری ایک کہانی ”پریم“ میں یہی شایہ اور یہی سائے ہیں.. تمہاری ہر تحریر میں کہیں نہ کہیں سے موت داخل ہو جاتی ہے اور کم از کم میرے لیے مرکزی کردار بن جاتی ہے.. ایسا کیوں ہے؟ کیا تم نے اس کا تجربہ کیا ہے.. اس کا ذائقہ چکھا ہے.. یا اس کے اتنے نزدیک گئے ہو کہ تم نے اس کے پار جو کچھ ہے اسے دیکھ لیا ہے.. تم ہمیشہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہو.. اس کی تمنا کرتے ہو یا اس سے اتنے خوفزدہ ہو کہ جو اس کھوپکے ہو.. تمہاری ہر سطر میں

”موت مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے.. ڈتھ!“

نیلی خانہ بدوش آنکھیں مرگلہ پہاڑیوں کے اندر ان میں پرائی آنکھوں سے پوشیدہ ندی کے بہاؤ کو ایک ایسی سکرین کی طرح دیکھتی تھیں سحر زدہ دیکھتی تھیں جیسے ان پانیوں پر وہ سب عبارتیں رقم ہیں.. وہ خود سے کچھ نہیں کہتی تھی صرف ان پر لکھی گئی عبارتوں کو ایک سپاٹ لہجے میں پڑھتی جاتی تھی جیسے ایک بچہ تختی پر لکھی گئی عبارت دوہراتا چلا جاتا ہے اور وہ سورج کی مدھم حدت سے عاری سرمائی کرنوں سے لٹکتی پانی کی سطح پر نظریں جمائے انہیں ایک ذہین بچے کی طرح بلا آنکھ پڑھتی جاتی تھی اور یہ عبارتیں ٹھہرتی نہ تھیں، بہاؤ کے ہمراہ بہہ جاتی تھیں اور ان کی جگہ نئی عبارتیں اس آبی تختی پر ظہور میں آجاتی تھیں..

بہاؤ کی روانی میں کمی آتی تھی تو وہ بھی مدھم ہو جاتی تھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگتی تھی اور جب پانیوں کا کوئی ریلا تیزی سے آتا تھا تو وہ بھی اس کی رفتار کے حساب سے تیز تیز بولنے لگتی تھی.. اسے وہ سب کچھ کہنا تھا جو پانیوں پر درج تھا اور بہتا جاتا تھا.. وہ کوئی ایک سطر ایک لفظ خطا نہیں کرنا چاہتی تھی.. ان عبارتوں کے بہہ جانے سے پیشتر انہیں خاور تک پہنچا دینا چاہتی تھی کیونکہ کوئی ایک لفظ یا ایک سطر بھی اگر زندگی کے تانے بانے کی بُنت میں سے رہ جائے تو وہ ادھوری رہ جاتی ہے.. اگر ایک لفظ بھی پانیوں کے ساتھ بہہ جائے تو وہ واپس نہیں آتا اور اس کی کمی سے بُنت میں سورخ رہ جاتا ہے..

مشرقی لہارے میں جو مکمل امریکی لہجہ تھا اس میں کہیں بناوٹ نہ تھی.. وہ آبائی تھا..

”تمہاری سب تحریروں میں موت حکمران ہے.. اسی فیکٹر نے مجھے فیزی نیٹ کیا

موت در آتی ہے۔ میں اس کے سیاہ بھنور کے گرداب میں ہوں۔ میں اس کا جواز نہیں سمجھ سکتی۔ تم سمجھا سکتے ہو کہ یہ کیا ہے۔۔۔“

پیر سہاؤہ کے دے ساڈ عارضی چائے خانوں سے ذرا آگے ایک کچی پتھرلی سڑک نیچے اترتی ہے۔ نیچے مرگلہ کے نشیب میں۔ بادی النظر میں یہ سڑک ایسی نہیں لگتی کہ اس پر کوئی عام کار آسانی سے اترے۔ عارضی چائے خانے مرگلہ کی ڈھلوان سے ذرا ادھر پکنک کے لیے آنے والے اسلام آبادی کراؤڈ سے بھرے پڑے تھے۔ سرکاری اور ذاتی۔۔۔ پاش اور مہنگی کاریں اور کوسٹر سڑک کے کناروں پر ادھر ادھر بے ترتیبی سے پارک کیے گئے تھے۔ بے جاشوخی سے کلبلاقی خواتین اور چیختے چلاتے بچے اور ان کے تھکے ہوئے اور بیزار خاوند اور باپ شکستہ کرسیوں پر اپنے آپ کو سنبھالتے پیر سہاؤہ کی بلندی سے نیچے نظر آنے والے دھندلاتے ہوئے شہر میں اپنے سیکٹر اپنی گلیاں اور اپنے مکان تلاش کرتے تھے۔ اپنے مکان کے نواح میں کسی اہم اور بڑی عمارت کو سپاٹ کر کے اس کی جانب انگلی سیدھی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی نہ نظر آنے والی گلی کا تعین کرتے تھے اور پھر اسے کھودیتے تھے اور یوں دھندلاتے ہوئے شہر کے نقشے میں بھٹکتے پھرتے تھے۔

پیر سہاؤہ کے ہالی ڈے کراؤڈ کی دوسری تفریح یہ تھی کہ وہ دامن کوہ سے آنے والی ہر کار اور جیپ کو نظر میں رکھتے تھے اور اس میں سوار لوگوں کی زندگیوں میں جھانکتے تھے۔ خاور نے اس ہجوم کے قریب رکنے کی بجائے ذرا آگے جا کر کار کو دائیں ہاتھ پر اس سڑک پر اتار دیا جو کچی اور پتھرلی تھی اور یکدم آس پاس کے منظر کو او جھل کر کے نیچے چلی جاتی تھی۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ نیچے مرگلہ کی پہاڑیوں کے اندر نشیب میں کیا ہے اور سڑک اسے کہاں لے جائے گی۔ وہ کار کو قابو میں رکھنے کے لیے اس کے گیر بڑی مشقت سے اور جھنجھلاہٹ میں بدلتا تھا کہ اسے اس کی عادت نہ تھی۔ اس کی اپنی کار بہت دنوں سے ورکشاپ میں کھلی پڑی تھی کیونکہ اس کا گیر بوکس ناکارہ ہو چکا تھا اور یہ کار ایک دوست سے حاصل کی گئی تھی۔ کسی دوسرے شخص کی کار کو ڈرائیو کرنا ایسے ہی جیسے کسی اجنبی کے بستر میں سونا اگرچہ کمبل چادریا تکیہ تو وہی ہوتے ہیں لیکن آپ بے آرام ہوتے رہتے ہیں۔ بہر طور یہ ادھار کی گاڑی انگلی ہوئی پتھروں سے نکراتی۔۔۔ کبھی اس کے بس سے باہر ہوتی اور کبھی قابو میں آتی اپنی

مرضی کی رفتار سے نیچے اترتی گئی اور جب گاڑی دھچکوں سے تقریباً بے قابو ہوتی نشیب میں گرتی چلی جاتی تھی تو اسے احساس ہوا کہ بیک ویو مرر کے ساتھ ایک بوسیدہ جھاپا ہوا موٹیے کے پھولوں کا ہار لٹکا ہوا ہے جو ہر جھٹکے کے ساتھ جھولتا ہے تو اس کی ناک کے قریب آتا ہے اور اس میں سے زوال کی بو آتی ہے۔ جیسے اولڈ ہٹیل ہوم میں صرف دوائیوں اور ٹیکوں کے سہارے زندہ رہنے والے بوڑھوں کے گوشت میں سے آتی ہے۔

ڈھلوان کا اختتام ہوا تو ایک ندی کہیں سے نمودار ہوئی اور ان کے سامنے وڈ سکرین کے پار بنے گئی۔ اس پر ایک ٹل تھا۔ انہیں اس ٹل سے ذرا فاصلے پر ندی کے کنارے کے پتھروں پر بیٹھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ اتنا عرصہ کہ وہ ٹل جس پر سفید کار کھڑی تھی اور اس میں زوال کی بو دالہا ہار لٹکتا تھا۔ مرگلہ کی یہ اس کے لیے بے نام ندی اور اس کے کناروں پر سر اٹھانے والے پتھرلی جھاڑیوں سے اٹنے پہاڑ ساکت ہو کر ایک تصویر میں بدل چکے تھے۔ زمانے بہت بیت گئے تھے۔ مدتیں گزر چکی تھیں۔ صرف پانیوں کے اوپر لٹکتی کر نہیں اس ٹھہراؤ کو اپنے زور سے توڑتی تھیں۔ پوری تصویر کو نہیں صرف اس کے ایک حصے کو جس میں بہاؤ کا تسلسل تھمتانہ تھا۔ وہ اپنی نشست کو ذرا بہتر کرنے کے لیے ہتھیلیاں پتھر پر جما کر ذرا کھسکتی تو اجرک سے بنی ہوئی اس کی شلوار کے پائینے بھی ذرا اکھٹک جاتے اور جاگزر کے اوپر اس کے سفید ٹخنے دکھائی دینے لگتے۔

”مجھے تم سے دلچسپی نہیں ہے۔ موت میں ہے۔ کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟“

کسی بھی کامیاب تخلیقی اور اچھی بخت کی کہانی میں ہر کردار ایک ہی صورت حال اور ایک ہی رابطے سے سامنے نہیں آتا۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر نیا کردار اپنے خاص پس منظر اور اپنی مخصوص لینڈ سکیپ کے ساتھ مختلف حالات سے کہانی کے اندر داخل ہو۔ لیکن زندگی پر آپ کوئی ایسی پابندی لاگو نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے بہاؤ میں چلی آتی ہے اور کہانی کی پرواہ نہیں کرتی۔ اسی لیے سلطانہ بھی اس کی زندگی میں اسی ایک ون دے سڑیٹ میں

سے نمودار ہوئی.. جس میں سے غلافی آنکھیں اور عابدہ سومر و داخل ہوئی تھیں.. ٹیلیفون کی دن وے سٹرپٹ میں سے..

حقیقت کو محض چاشنی کی خاطر تو نہیں بدلا جاسکتا..

صرف یکسانیت کو توڑنے کے لیے غیر حقیقی تغیر کی آمیزش تو نہیں کی جاسکتی.. اسی لیے وہی ٹیلی فون تھا..

بارہ کہو کا وہی بل ڈوزر کے بلیڈوں کے خوف سے دبا ہوا گھر تھا..

”کین آئی سپیک ٹو مسٹر خاور پلیز...“ یہ آواز نہ تو جسی انداز میں گھنٹی ہوتی تھی اور نہ ہی آنسو بہاتی لرزش میں تھی.. یہ ایک کاروباری انداز کی ٹھنڈی اور براہ راست آواز تھی۔

”سپیکنگ...“

ابتدائی گفتگو ایک سراسر اور شدید امریکی لہجے کی انگریزی میں تھی۔ روانی اور بے پروائی کی کیفیت میں۔

”میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں.. اگر یہ ممکن ہو اور آپ برائے منائیں تو..“

”کس سلسلے میں؟“ اس نے حسب عادت دریافت کیا..

”موت کے سلسلے میں...“

وہ چپ ہو گیا.. بہت دیر تک خاموش رہا اپنے آپ کو باور کروانے کے لیے کہ اس نے یہی کہا تھا کہ.. موت کے سلسلے میں.. یہ کیا جواب ہوا.. ٹیلی فون کا سیاہ چوٹا ایک پھنپھو سانپ کی طرح پھیلا ہوا تھا اور وہ اسے ایک خوفزدہ کبوتر کی مانند آنکھیں جھپکے بغیر دیکھے چلا جا رہا تھا.. یہ کیا جواب ہوا..

”آریو بٹل دیئر مسٹر خاور..“

”یس آئی ایم...“

”میں نے ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے کہ کیا آپ سے ملاقات ممکن ہے؟.. اگر نہیں تو آپ انکار کر سکتے ہیں..“

”آپ کون ہیں؟“

”میں اپنا تعارف کروائے دیتی ہوں.. میرا نام ڈاکٹر سلطانہ شاہ ہے.. میرا تعلق

کوئٹہ سے ہے اور میں اسلام آباد میں ایک کینیڈین این جی او میں کام کرتی ہوں..“

”آپ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں؟“

”نہیں.. میں نے انٹرویو پوجی میں ڈاکٹریت کی ہے امریکہ سے.. آئی ایم سوری لیکن آپ بہت پوچھ گچھ کر رہے ہیں.. پاکستان میں تو خواتین سے اتنے سوال نہیں پوچھے جاتے.. میں آپ سے ڈیٹ نہیں مانگ رہی صرف ایک سرسری ملاقات کرنا چاہتی ہوں اپنی ایک الجھن دور کرنے کے لیے.. دیٹس آل...“

”آپ مجھے موت کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں.. ڈیٹھ؟“

”ہاں...“

وہ پھر چپ ہو گیا.. ایسے کرداروں کے ساتھ اس کا سابقہ پڑتا رہتا تھا جو کسی ایک موضوع کے اسیر ہوتے تھے.. خود کشی کی کیا وجوہات ہوتی ہیں... تخلیق کا منہ کیا ہے.. کیا یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے... اور وہ دن رات اس موضوع کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے سرگرداں رہتے تھے.. لائبریریوں میں پہروں بیٹھ کر ریسرچ کرتے تھے.. مختلف لوگوں کو.. اس جیسے لوگوں کو طویل سوالنامے بھیجتے تھے اور پھر اس موضوع سے اکتا کر کسی اور طرف نکل جاتے تھے.. لیکن یہ خاتون پی ایچ ڈی کر چکی تھیں، علم انسان میں.. اور اس علم میں موت سر فہرست تھی.. بشر کی فنا سے تو اس کا آغاز ہوتا تھا.. شاید موت میں اس کی دلچسپی اسی حوالے سے تھی..

”آئی ایم سوری لیکن اس ہفتے تو شاید یہ ممکن نہ ہو سکے..“

”یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے؟“

”ہاں.. آں...“

”شاید اگلے ہفتے...؟“

”جی..“

”تو آپ اجازت دیں تو میں اگلے ہفتے آپ سے رابطہ کر کے چیک کر سکتی ہوں.. کوئی روز اور کس وقت؟..“

”کسی روز بھی... میں بہت کم گھر سے باہر جاتا ہوں..“

”تھینک یو...“

وہ جہاں کہیں بھی اردو کا سہارا لیتی تھی تو ذرا رک رک کر لفظ چبا چبا کر بولتی تھی اور جب اظہار میں دشواری ہونے لگتی تھی تو امریکی لہجہ کی انگریزی میں رواں ہو جاتی تھی اور اس کا اظہار وسیع ہو جاتا تھا۔

اگلی شام بڑے پتھر کی کھوہ سے روپوش آخری چکن اینڈ چیز سینڈویچ کھاتے ہوئے اس نے نہایت سرسری انداز میں اس ٹیلی فون کال کا ذکر کیا۔

”آہا... ایک اور کیس... عابدہ سومرو کے بعد ایک اور گرفتار محبت...“ اس نے ہنستے ہوئے اپنی غلامی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور وہ واقعی بے حد خوش نظر آرہی تھی۔ ”لیکن یار اولیت تو مجھے حاصل ہے اس لیے مجھے فوقیت دینا۔ اب تو ماشاء اللہ رونق ہو گئی ہے۔ اور تم یقین نہیں کرتے تھے کہ عمر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تمہارا تو ون ٹریک ماسنڈ ہے...“ خاور نے جھلا کر کہا تھا۔ ”ہر کوئی تمہاری طرح پاگل خانہ نہیں ہے۔ اس نے انتھروپولوجی میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے اور اسے موت کی حقیقت کے بارے میں کوئی الجھن ہے جو وہ مجھ سے مل کر سلجھانا چاہتی ہے۔“

”اسے کیا پتہ کہ موت کیا ہے...“ اس کا لہجہ... اس کا رنگ بدلا اور اس نے ایک خاص زہر آلود انداز میں جیسے تھوکتے ہوئے کہا۔

خاور کے سامنے وہ بری طرح سرزنس لگی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ لیکن اسے موت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم... یہ تم اسے میری طرف سے بتا سکتے ہو۔ اور تمہیں بھی کچھ نہیں معلوم۔ تحریروں میں تم اس کے ساتھ رومانس لڑا سکتے ہو۔ بہت گیانی ہو کر اس کی حکمت کو بیان کر سکتے ہو لیکن تمہیں بھی کچھ پتہ نہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ تم درست کہتی ہو لیکن میں نے کبھی دعویٰ بھی نہیں کیا۔ تو اس میں مجھ سے ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔“

”آئی ایم سوری۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگی اور فوراً نارمل ہو گئی ”میں تھوڑی سی جلیس ہو گئی تھی۔“

”جلیس کی گنجائش تم نے خود نکال لی ہے ورنہ یہ خاتون صرف ایک خالصتاً علمی

حوالے سے مجھے ملنا چاہتی ہے۔“

”نہ۔۔۔ اس نے اپنی انگلی کھڑی کر دی۔“ نہ۔۔۔“

”کیوں نہ۔۔۔“ وہ جھنجھلا گیا۔

”علمی حوالوں کے لیے تو لائبریریاں اور بوڑھے سکالر بھرے پڑے ہیں۔ یہ

محض ایک بہانہ ہے۔ دے بچا از آفریو۔۔۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے میں اگرچہ سکالر نہیں مگر بوڑھے ہونے کی شرط پوری

کرتا ہوں۔“

”تم اتنے بوڑھے نہیں ہو۔“ وہ اسے جھک کرنے پر تکی ہوئی تھی۔ ”آئی ایم

جلیس۔“

”تم عابدہ سومرو سے تو کبھی جلیس نہیں ہوئیں۔“

”وہ کیس بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ ہاں اس ڈاکٹر صاحب کو عابدہ کے ساتھ

رابطہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ ہے جو موت کو جانتی ہے۔ یہ تمہاری ڈاکٹر شادی شدہ ہے؟“

”کچھ ہوش کے ناخن لو۔۔۔ یہ میں اس سے کیسے پوچھ سکتا تھا۔ اس کا لہجہ بالکل سپاٹ

اور کاروباری طرح کا تھا۔“

”تو پھر وہ کاروبار کرے گی خاور ڈیر۔۔۔ پی ایچ ڈی ان انتھروپولوجی... کیا میں ابھی

سے اس کے سراپے کا نقشہ کھینچ دوں۔۔۔ تم پتہ نہیں کن خیالوں میں ہو۔ لیکن وہ اگر شادی

شدہ نہیں ہے تو طلاق یافتہ ضرور ہے۔ کنواری ہوتی تو یوں بے دھڑک تم سے رابطہ نہ کرتی۔

کم از کم پینتالیس برس کی ہے۔ یعنی مجھ سے کچھ بڑی۔ موٹی ہے۔ دبیز شیشوں کی عینک لگاتی

ہے اور اسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا اور وہ تمہیں چرنے آگئی ہے۔“

”اس چراگاہ میں چرنے کو کچھ باقی ہی نہیں تو وہ کیا چرنے آگئی ہے؟“ وہ اس کے

تجزیے سے بے حد محفوظ ہو رہا تھا اور خوشگوار موڈ میں تھا۔

”منہ مارنے آگئی ہے۔“

وہ اس سے بے حد پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی غلامی آنکھیں بوجھل تیلیوں کی

طرح خاور کے بدن کی گھاس پر براجمان ہوتی تھیں۔ چند لمحوں کے لیے بوجھ ڈالتی تھیں

اور پھر اڑ جاتی تھیں۔ ایک اور شام تھی اور بارہ کبوتر کے دیہات میں اس کی آمد پر کہیں کہیں

بلب روشن ہوتے جاتے تھے.. اس کے رد عمل میں حسد کی جو لہر آئی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب اس میں رقابت کا کوئی جذبہ نہ تھا اور وہ اس کی رفاقت میں خوش اور لاپرواہ تھی ”پہلے یہ بتاؤ کہ اس سندھی وڈیرن نے تمہارے ساتھ کیا کیا... اس نے بھی منہ مارا کہ نہیں...“

وہ ایک سمجھ میں نہ آنے والا وجود تھا جو پل میں کچھ ہوتا تھا اور پھر کچھ اور... ”میں نے تمہیں بتایا تو ہے... تم بھی اگر تجربہ کر لیتیں تو تم بھی جان جاتیں کہ اس چراگاہ میں تو گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں تو وہ کیسے منہ مار سکتی تھی..“

”پلیز پلیز..“ وہ بچوں کی طرح اٹھلاتی ہوئی منہ بسورتی ضد کرنے لگی۔ ”موسیٰ تو اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے.. منہ مارنے کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں۔ کوشش تو کرتا ہے.. پلیز پلیز مجھے بتاؤ..“

خاور نے اس لاپرواہ کیفیت میں.. اس یقین کے ساتھ کہ وہ عابدہ سومرو کے لیے صرف ہمدردی کے جذبات رکھتی ہے اور ان میں رقابت کا ایک ذرہ بھی شامل نہیں.. بارہ کھو کے دیہات پر اترنے والی شام میں... کچھ جزیات کو چھپا کر پلنگ کے سرہانے ایستادہ مور اور اس میں جڑے سات آئینوں کے بارے میں بتایا..

”وہاٹ؟“ اس نے خاور کا بازو جیسے ایک آہنی شکنجے میں جکڑ لیا.. اس کی گرفت اتنی کڑی تھی کہ اسے درد کو سہارنے کے لیے دانت بھینچنے پڑے.. ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو..“ اس کا یہ رد عمل بہت اچانک تھا اور خاور خوفزدہ ہو گیا ”ایسی کوئی بات نہیں ہوئی..“

”ہاں اسی لیے تم اگلے روز اسلام آباد واپس آنے کی بجائے تین دن وہیں ٹھہرے رہے تھے.. میں ایئرپورٹ پر جاتی رہی تھی..“ وہ ایک مختلف عورت ہو چکی تھی.. بے قابو اور پاگل پن کے آس پاس ”اسی لیے.. اس کو ٹھڑی کی چابی تو میرے پاس تھی جس کے اندر میں نے تمہیں سنبھال رکھا تھا اور مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارے ساتھ میں نے اس کتیا کو بھی بند کر دیا ہے..“ اس نے ہینڈ بیگ کھول کر دو کیپسیول کا نچے تھر تھراتے ہاتھوں سے پتے کو چیر کر نکالے اور پانی کے بغیر نگل گئی۔ ”ڈیو ہو سیکس و دہر؟“

”اس عمر میں تو یہ مشکل ہو جاتا ہے..“ خاور نے اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے بمشکل ہنس کر کہا..

”مجھے بتاؤ.. ڈیو یو؟“

”نہیں..“

”پلیز پلیز.. مجھے بتاؤ.. ڈیو یو؟..“ اور اس کی آنکھوں میں جھڑیاں لگ گئیں.. اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا.. اور وہ گردن کے راستے بہہ کر اس کے گریبان کے اندر سرایت کرتے ہوئے اس کی قمیض کو گیلا کرنے لگے..

”نہیں..“

”تمہاری آواز میں یقین نہیں ہے..“ وہ ہسٹریائی ہو گئی ”میں نہیں برداشت کر سکتی.. تم مرزا صاحب جیسے نہیں ہو سکتے لیکن میں جانتی ہوں کہ چراگاہ ابھی ویران نہیں ہوئی.. گھاس کے تنکے ابھی ہیں.. وہ نیلے سویٹر میں ابھی تک الجھے ہوئے ہیں.. میں جانتی ہوں..“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے اس سے پیشتر کہ بارہ کھو کے ہر گھر میں تمہاری چیخنی ہوئی آواز پہنچ جائے اور لوگ یہاں تک آجائیں یہ جاننے کے لئے کہ یہ پاگل عورت کون ہے.. اور اگر تم کار میں نہیں بیٹھو گی تو میں آسانی سے پیدل نیچے اتر سکتا ہوں اور اپنے گھر تک جاسکتا ہوں..“

وہ جس یک لختگی سے ہسٹریائی ہوئی تھی.. ایک ہی پل میں سڑکیاں پھلانگتی عرش تک جا پہنچی تھی اسی بے محابہ رفتار سے اگلے پل میں نیچے آگئی ”آئی ایم سوری.. پاگل خانہ تو ایسا ہی ہوتا ہے..“

”کار میں بیٹھو..“ وہ ایک بے دام غلام کی طرح دروازہ کھول کر ڈرائیور کی نشست پر بیٹھ گئی..

وہ آنسو پونچھتی ہوئی سراسر نارمل ہو گئی.. کار نیچے اتر کر سملی روڈ پر دائیں جانب مڑی تو وہ ایک سکول گرل کی طرح ہنستی ہوئی چلبلاہٹ کے ساتھ کہنے لگی ”پی ایچ ڈی ان انٹرویو پو لوجی.. ہاں.. مجھ سے شرط لگا لو وہ پینتالیس برس سے کم نہیں ہے.. موٹی اور بد شکل ہے اور عینک لگاتی ہے..“ ازدیٹ اے بیٹ؟“

پورے سات روز کے بعد.. وہ پھر لائن پر تھی..

جانا“ وہ مسکراہٹ سے ہنسی میں آگیا۔ اور پھر اس وارڈروب کی جانب چلا گیا جس میں گندے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے وہ جانتا تھا کہ اس کے لئے وقت گزارنے کے لئے کوئی نہ کوئی امرت دھارا موجود ہوگا۔

کورڈ مارکیٹ کے باہر سرما کی دھوپ میں ناکوں کے فٹ پاتھ پر افغانی بینڈی کرافٹس بھی ہوئی تھیں۔ مزار شریف کے آئینے بدخشاں کی پرانی صراحیوں۔ کنگن۔ جھمکے۔ جزاؤہار۔ چاندی کی پازیتیں۔ قیمتی پتھر۔ انگوٹھیاں۔ روسی سپاہیوں کی سمور کی ٹوپیاں جن پر ابھی تک ریڈ سنار جڑے ہوئے تھے۔ غالیچے اور سموور۔ لیکن یہ سب کے سب اس ثقافت کی نمائندگی کرتے تھے جو کابل سے دور۔ دریائے آمو کے کناروں کی تھی۔ اور ان نوادرات پر ڈپلومیٹک انگلیو سے آنے والی غیر ملکی خواتین جھکی تھیں اور بھاؤ تاؤ میں مصروف تھیں۔

کورڈ مارکیٹ کے داخلے کے دروازے کے برابر میں ایک بیزار سا شخص پکڑے تل رہا تھا اور گاہک بڑے تحمل سے اپنی باری کے منتظر تھے۔

اس ڈھکی ہوئی مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک سکون اور ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے اور باہر پھیلے کنکریٹ کے کیپٹل سنی کا وجود تحلیل ہو جاتا ہے۔

دائیں جانب۔ مارکیٹ کے اندر جانے پر اس پارسی جنٹلمین کا سنور تھا جہاں سے آپ گل دنیا کی اشیائے خورد و نوش حاصل کر سکتے تھے۔ تازہ سوس پیئر۔ بٹکاک کی ٹونا فش۔ امریکہ میں بھری ہوئی مشروبات کے ٹن۔ ہسپانوی زیتون سر کے میں بھگوئے ہوئے۔ ہائینز کی انگلیش بینز اور سوپ۔ اٹالین سپاگینی۔ اور جرمن سائیج۔ پاکستان کے علاوہ وہاں ہر قومیت کی خوراک شیلوں پر رکھی تھی۔

یہ پارسی سنور کورڈ مارکیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ پر تھا اور بائیں جانب ایک خزانہ اور کچھ گولہ لٹاپی پہنے دکاندار کے شیشے کے شوکیس اور کاؤنٹر تھے جو ان کے عقب میں کھڑا بھی نماز سے فارغ ہو کر آیا تھا یا اگلی نماز پر جانے کی تیاری میں تھا ہمیشہ اسے دیکھ کر کہتا ”آئیے خاور صاحب۔ چائے تو پیو گے۔ بسکٹ تو کھاؤ گے۔“ اور وہ اس انداز میں یہ دعوت دیتا کہ مہربانی کرو میں تو یونہی پوچھ رہا ہوں۔ قبول نہ کر لینا۔

اس خزانہ دکاندار کے کاؤنٹر کے قریب اس نے اسے وقت دیا تھا۔

”کیا یہ ممکن ہے؟“

”جی۔“

”کہاں؟“

”جہاں آپ پسند کریں۔“

”میں پھر بتا دوں کہ یہ صرف موت ہے جو مجھے الجھا رہی ہے۔ تو کہیں بھی۔“

جہاں ہم اطمینان سے بیٹھ کر تھوڑی دیر باتیں کر سکیں۔ یہ آپ پر منحصر ہے کہ کہاں۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔“

اسلام آباد کی ڈھکی ہوئی۔ کورڈ مارکیٹ کے باہر فٹ پاتھ کے کنارے خاور نے قیصر سے مستعار شدہ سفید گاڑی بمشکل پارک کی۔ وہ صبح سویرے ڈیوٹی پر جانے سے پیشتر اس سے ملنے آگیا تھا۔ وہ آج کی ملاقات اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی ذاتی کار در کشاپ میں کھلی پڑی تھی اور وہ اس الجھن میں تھا کہ کیا یہاں سے مری روڈ تک ایک سوزو کی ویگن میں جانا اور پھر وہاں سے ٹیکسی حاصل کر کے کورڈ مارکیٹ تک پہنچنا۔ صرف اس لئے کہ وہاں کوئی خاتون موت کے سیاہ نظریات دامن میں سمیٹے اس کی منتظر ہے۔ اتنے تردد کے لائق ہے؟ چنانچہ اس نے اپنے اس مڈل ایجنڈ پلے بوائے دوست کو نہ چاہتے ہوئے بھی موجودہ صورت حال بیان کر دی ”یار مجھے بھی ایک ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ کسی معنگ اور موٹی اوئیز عمر عورت سے ملاقات کرنی ہے۔ تو تم اتنی دیر یہاں آرام سے بیٹھو۔ تمہیں چائے بنا کر دیتا ہوں اور میں ایک گھنٹے کے اندر اندر اسے بھگتا کر واپس آتا ہوں۔“

”شاہ جی۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ آپ کی زندگی میں ایک عورت۔“

قیصر اگر یہ سوچتا تھا کہ وہ فارغ ہو چکا ہے۔ بٹھر ہو چکا ہے۔ اور چراگاہ میں گھاس کا ایک تنکا بھی نہیں ہے تو اسے الزام نہیں دیا جاسکتا تھا۔ خاور اگر اسے غلافی آنکھوں اور عابدہ کے بارے میں بتاتا تو وہ قطعی طور پر یقین نہ کرتا۔ چہ جائیکہ ایک اور عورت۔

”نہیں نہیں۔ ایک کاروباری قسم کی مختصر سی پائٹ منٹ ہے یار۔“

”بسم اللہ۔“ قیصر نے اپنی جادو بھری مسکراہٹ جو صنف نازک کے لئے سراسر

مرگ تھی اس پر نچھاور کرتے ہوئے کار کی چابی اسے تھما دی ”کچھ کر کے آنا شاہ جی۔ خالی نہ آ

”میں آپ کو کیسے پہچانوں گی؟“

وہ سشدر رہ گیا تھا۔

”آپ نے مجھے نیلی ویشن پر تو دیکھا ہوگا؟“

”نہیں.. میں بہت عرصے سے امریکہ میں تھی.. یہاں آکر بھی مجھے نیلی ویشن

دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تو میں آپ کو کیسے پہچانوں گی..“

”میں...“ اس نے کوشش کی کہ اپنا حلیہ بیان کر سکے.. ”بہر حال... آپ فلاں

کاؤنٹر کے پاس آجائیں تو...“

”میں اپنے بارے میں بتا دیتی ہوں.. میں اپنا لباس بہت زیادہ تبدیل نہیں کرتی۔

میرے پاس صرف دو تین جوڑے ہیں.. آئی مین پاکستانی.. ابھی میں اجرک کا ایک کر رہ شلوار

پہنے ہوئے ہوں سفید ننگے کے جو گرز کے ساتھ.. آئی ہوپ کے آپ مجھے پہچان جائیں

گے۔“

یہ پہلی بار تھا کہ وہ کورڈ مارکیٹ کے ٹھہراؤ میں داخل ہوا تھا اور اس کے پاس

خریداری کی کوئی فہرست نہ تھی.. پارسی کے سنور کے باہر وہ ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا کیونکہ

کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے پارسی کی نظر اس تک آ جاتی تو وہ فوراً نہایت خوشدلی سے اسے خوش

آمدید کہتا اور وہ یہاں یوں بے مقصد دیکھا نہیں جانا چاہتا تھا.. اس نے بہت بے آرام اور

مجرم سا محسوس کیا جیسے مارکیٹ میں داخل ہونے والا ہر شخص صرف اسے ہی شک کی نظروں

سے دیکھ رہا ہے.. تھوڑی دیر کے بعد اس نے خرائٹ دکاندار کے شوکیسوں کی جانب نگاہ کی تو

وہاں بہت لوگ تھے.. بچے اونٹنیوں پر لڑائی کرتے ہوئے.. جرابوں کی قیمتوں پر عورتیں

جھگڑتی ہوئی اور کم از کم ایک مرد جو ایک انڈرویز کو آنکھوں کے سامنے لا کر اس کے لاسٹک

کو کھینچ کر اس کے اور اپنے سائز کا اندازہ لگا رہا تھا.. بہت سے لوگ تھے.. اور ان کے درمیان

میں ایک لڑکی کی پشت دکھائی دے رہی تھی.. باب کٹ نیم سنہری ہال اجرک کے کڑتے کی

قربت میں آکر مختصر ہوتے جھولتے ہوئے اور ان میں سے کسی ایک لمبے میں سفید گردن کی

ایک جھلک.. اور پاؤں میں سفید جوگر.. وہ ابھی جھجک میں تھا کہ اسی لمبے وہ شوکیس سے

نظریں ہٹا کر پلٹی۔ اس کی آنکھیں متلاشی تھیں لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ ایک خلا

میں دیکھتی تھی اسے پہچانتی نہیں تھی.. وقت کی اس مختصر کٹرن میں اگر وہ وہی تھی۔ خاور نے

صرف اس کی نیلی آنکھوں کو دیکھا جو بے راہرو آوارہ اور خانہ بدوش تھیں، کہیں صحراؤں

اور ویرانوں میں مقیم تھیں۔ بے لگام اور وحشی تھیں.. اور ایک مرتبہ آنکھیں جھپکنے کے تیز

اور مختصر ترین وقفے میں خاور کی غیر جانبداری بے اثر ہو گئی..

عابدہ سومرو اور غلامی آنکھوں نے کبھی اس کے پورے وجود پر یوں دھاوا نہیں بولا تھا..

اور اس لمحے اس نے اپنے آپ سے کہا.. ابھی وقت ہے.. تم فرار ہو جاؤ.. بچ

نکلو.. کہ زندگی میں پہلی بار تم نیلاہٹ کے اس جال میں الجھ سکتے ہو.. خطرے کا سرخ نشان جل

بجھ رہا ہے تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ ابھی وقت ہے..

نیلی متلاشی آنکھیں کورڈ مارکیٹ میں داخل ہونے والے ہر شخص کو پرکھ رہی

تھیں..

شاید یہ وہ نہ ہو.. اس میں ابھی تک جھجک تھی جب وہ آگے ہوا.. ”ڈاکٹر سلطانہ؟“

اس کی خالی آنکھیں یکدم بھر گئیں.. ”یس آئی ایم..“

ایک نازک ملوک سی لڑکی جس کی نیلگوں آنکھیں اس کے سراپے کی جانب

جانے ہی نہ دیتی تھیں جیسے سومات مند ر کے بت کے ماتھے میں جزا زمرہ اس بت کی ہیئت

کو اپنی جگہ گاہٹ سے چند حیا کر نظروں سے اوچھل کر دیتا ہے..

”میرا خیال ہے آپ مجھے جانتی ہیں...“

”ہاں...“ اس نے گردن میڑھی کر کے سر جھٹکا تو باب کٹ ہال بھی حرکت میں

آگئے اور ان کی نیم سنہری چلمن میں سے اس کے ایک کان اور گردن کی جھلک آئی.. کہیں

کہیں کوئی ایک آدھ ہال سفید بھی تھا.. ”میں یہاں بہت بے آرام محسوس کر رہی تھی.. شکر

ہے کہ آپ وقت پر آگئے..“

”جی بالکل...“ وہ بالکل ایک ٹین ایجر کی طرح نروس ہو گیا اور غصے میں پڑ گیا کہ

اب کیا کیا جائے..

”کیا ہم یہیں کھڑے رہیں گے؟.. اس کا بدن دبلا اور سیدھا تھا اور اس کے لباس

سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پر زیادہ توجہ دینا مناسب نہیں سمجھتی..

”آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟.. وہ اس خیال سے آیا تھا کہ کورڈ مارکیٹ کے برابر

میں بازار روڈ کے ساتھ جو اوپن ایئر ریسٹوران ہے وہاں کچھ وقت گزار کر اسے بھگنا دیا جائے

گا.. لیکن وہ بھگتانی والی شکل کی نہیں تھی.. وہ غلامی آنکھوں کے بیان کردہ سراپے سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی..

”جہاں ہم باتیں کر سکیں.. اطمینان کے ساتھ..“

دامن کوہ سے آگے بل کھاتی سڑک جب ہموار ہو کر بیرسہاواتک پہنچتی تھی تو وہاں دسے سائڈ چائے خانوں میں بہت جھوم تھا..

کچی سڑک پر اترتے ہوئے وہ اجنبی کار کے گیرز سے الجھتا رہا لیکن ہمہ وقت اسے برابر کی نشست پر براجمان کسی وجود کا نہیں بلکہ نیلاہٹ میں ڈوبتی آوارہ خانہ بدوش آنکھوں کے ایک گہرے سمندر کے موجزن ہونے کا احساس ہوتا تھا جو اس کو اپنے اندر ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتا تھا..

ایک کرن چمکی تھی.. ایک رمتی بیدار ہوئی تھی.. پاگل خانے اور عابدہ میں یہ رمتی کہیں نہ تھی اور وہ لا تعلق رہا تھا جذبات کی سطح پر... لیکن غیب سے یہ نیل کرایاں نیلاں جو تن من کو نیلو نیل کر رہی تھیں آنکھیں نازل ہو گئی تھیں اور ایک پرانی کار میں اس کے برابر میں پر سکون بیٹھی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ عقبی آئینے سے جھولتا موتیے کا بوسیدہ اور زوال پذیر ہار جس شخص کی ناک کو کبھی چھو لیتا ہے تو وہ شخص اس کی مانند بوسیدگی اور زوال کا شکار ہے اور اس کے باوجود اس کی حیاتی میں پہلی بار ایک رمتی بیدار ہوئی تھی.. اس کی ویران چراگاہ میں گھاس کے تنکے پھونٹتے تھے..

”مجھے تم میں دلچسپی نہیں، موت میں ہے.. کیا تم اس کی وضاحت کر سکتے ہو؟“

”میں اس کی کوئی ایسی توجیح تو نہیں کر سکتا چند فقرہ میں جو اسے بیان کر دے..

آج تک کوئی بیان کر پایا ہے جو میں کر سکوں.. میں اس کے بارے میں کبھی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتا اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جنہوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی وہ یا تو اس کھو بیٹھے یا تارک الدنیا ہو گئے.. بیشتر مذاہب کی بنیاد ہی موت کا خوف ہے.. لیکن میں یہ جانتا ہوں ہر شے کی کشش چاہے وہ ایک منظر ہو یا شکل ہو فنا میں پنہاں ہے.. منظر میں یہی فنا کشش بھرتی ہے کہ میں نہ ہوں گا اور یہ سب کچھ ہوگا.. اور

شکل تو خود فنا ہے اس کے وجود کا عناصر میں تحلیل ہو جانے کا ڈر ہی اسے حسن دیتا ہے..“

”نہیں.. یہ خیال ہے اور میں حقیقت جانا چاہتی ہوں.. کہ موت کیا ہوتی ہے اور کیوں ہوتی ہے؟“

”ایک لکھنے والا حساب کا سوال حل نہیں کر سکتا.. کوئی ایک درست جواب نہیں دے سکتا جو اسے پورے کے پورے نمبر دے دے.. میرا خیال ہے کہ میں وہ شخص نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش ہے..“

”آپ کی ہر تحریر میں موت ہے اور میں طویل حوالے دے سکتی ہوں..“

”یہ بالکل الگ بات ہے اگرچہ میں آپ کے ٹیلی فون سے بیشتر اس امر سے آگاہ نہیں تھا.. میری تحریر کے پس منظر میں اگر موت کے سائے ہوتے ہیں تو میں انہیں خود جان بوجھ کر تخلیق نہیں کرتا.. وہ اس تحریر اور اسے لکھنے والے کی بالآخر فنا کا پیغام ہوتا ہے جو خود بخود... بھیجنے والے کی خواہش کا تابع ہوتا ہے..“

”اگر میں ایک مثال دوں تو آپ اسے سن لیں گے؟“

”میں اتنے تردد سے آپ کو کورڈھار کیٹ سے یہاں.. اس ندی کی الگ تھلک تنہائی میں لایا ہوں.. تو صرف اس لیے کہ بقول آپ کے.. ہم باتیں کر سکیں.. تو آپ باتیں کریں..“

اگرچہ وہ یہ کہتے ہوئے مسکرایا تھا کہ شاید یوں گفتگو کا موضوع بدل جائے.. وہ کوئی اور بات کرے.. اپنے بارے میں.. اس سے کچھ پوچھے کچھ سنے.. لیکن اس نے اس کی جانب دیکھا تک نہیں ندی کے بہاؤ پر نظریں جمائے بیٹھی رہی.. وہ اپنے آپ کو کوٹھنے لگا.. ایک کاروباری ملاقات میں تو آنکھوں کی نیلاہٹ یا ان کی خانہ بدوش بے راہروی زیر بحث نہیں آسکتے.. یہ محض ایک بزنس میٹنگ تھی.. اور ایجنڈے پر صرف ایک ہی آئٹم تھی.. موت!

وہ ٹانگیں سمیٹے.. ان کے گرد بازو حائل کیے.. جیسے پو آجی اپنی پگڑی کو ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر مزے سے بیٹھ جاتے تھے.. گھنٹوں پر سر رکھے اس کی موجودگی سے کسی حد تک لا تعلق پانیوں کو دیکھتی ہوئی اور یقیناً انہیں مزید نیلا کرتی ہوئی بولنے لگی ”وہ ایک چمکیلا تیز روشنی والا دن تھا.. میں جس چہرے جس درخت کو دیکھتی تھی تو وہ نکھرا ہوا لگتا تھا اور میں اسے

اگرچہ اس کی شادی میری چھوٹی بہن سے ہو رہی تھی لیکن.. میں تھی جو اس کے ساتھ محبت میں مبتلا تھی اور ظاہر نہیں کرتی تھی..

تمہیں تو پتہ ہے کہ مشرقی اقدار میں اپنی محبت کی قربانی دینا اور چُپ رہنا کتنا قابلِ تحسین اور عظیم فعل ہے.. اگرچہ میں مشرقی اقدار کی کوئی ایسی پابند بھی نہ تھی..

مجھے اپنے باپ کی سائیکل ابھی تک یاد ہے.. اس کے ہینڈل پر لگی گھنٹی کو بار بار بجانا میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہوتی تھی.. وہ گھنٹی گویا کسی جادو سے بھری تھی جو میرے ننھے منے ہاتھ کی جانب شعاعیں بھیجتی تھی کہ میرے قریب آؤ.. تمہارا انگوٹھا بہت مٹا سا ہے اور نرم ہے اور تمہیں بہت زور لگانا پڑے گا اس دروازے کو کھولنے کے لیے لیکن سنو میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور جو نبی تم اپنا انگوٹھا مجھ پر جماؤ گی تو تمہیں زور لگا کر دھکیلنے کی ضرورت نہیں پڑے گی میں خود بخود تمہیں جادوئی موسیقی سنانے لگوں گی... اور میں ڈرتی ڈرتی لطف سے لرزتی اپنے باپ کی جانب کن اکیوں سے دیکھتی اور اس کے چہرے پر ”شاباش بیٹی.. بجاؤ“ کی مسکراہٹ ہوتی اور میں اپنا انگوٹھا گھنٹی پر رکھ دیتی.. اور واقعی وہ اپنے وعدے کے مطابق صرف میرے لمس سے ٹنن ٹنن بجنے لگتی... بعد کی زندگی میں.. جب میں امریکہ میں تھی.. جب کبھی میں نے گزشتہ زندگی کے بندھے ہوئے ساکت اقدار کو توڑا.. الگوئل کا جو بھی گھونٹ بھرا.. کسی مرد کے ساتھ آشنائی کا پہلا قدم اٹھایا تو وہ گھنٹی کہیں نہ کہیں سے ٹنن ٹنن کرتی میرے کانوں تک آجاتی تھی اور پھر ان کے پردے اپنے لیے بند پا کر لوٹ جاتی تھی.. میں سنتی تھی اور اُن سنی کر دیتی تھی..

اپنے باپ کو.. بابا کو.. جب میں نے سوچا سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے سر جھکا کر ہمارے کچے مکان کے چھوٹے دروازے میں سے داخل ہوتے ہوئے سوچا! میں کبھی انہیں اس سائیکل سے الگ نہ کر سکی.. نہ کبھی صرف ان کا چہرہ میرے ذہن میں آیا نہ کبھی وہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے سکول رجسٹر پر گئی رات جھکے ہوئے پہلی تاریخ کو ناکافی تنخواہ کو بار بار گنتے ہوئے ماتھے پر معاشی تنگی کی سلونیں لئے ہوئے میں نے کبھی انہیں نہ دیکھا.. بعد کی زندگی میں وہ ہمیشہ سائیکل کے ہینڈل پر ہاتھ دھرے اپنی پرانی عینک درست کرتے میری جانب دیکھتے تھے..

ان کی سائیکل بہت آراستہ پیراستہ ہوتی تھی.. تم کہہ سکتے ہو کہ فلی لوڈڈ ہو کر تھی

چوم سکتی تھی.. میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھتی تھی تو وہ نکھر اہوا لگتا تھا اور میں اسے چوم سکتی تھی.. میں اتنی خوش تھی کہ میں خود اپنے آپ کو پھول دینا چاہتی تھی.. میں نے ایک فلاور شاپ کے اندر جا کر اپنا پرس کاؤنٹر پر اُلٹا دیا اور فلاور سٹ سے کہا کہ جتنی بھی رقم ہے مجھے اس کے پھول دے دو.. اور وہ ایک بہت ہی بڑا اور ناقابلِ یقین رنگوں والا بُو کے تھا اور اتنا بڑا تھا کہ دور سے میں نظر نہیں آتی تھی وہ بُو کے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا نظر آتا تھا.. اور میں خوش تھی.. اور اس لمحے اگر کوئی گداگر بھی مجھ سے مخاطب ہو کر صرف ”ہیلو“ کہہ دیتا تو میں وہ بُو کے اسے پیش کر دیتی میں اتنی خوش تھی.. میں اپنی پارٹنمنٹ بلڈنگ کی اٹھائیسویں منزل پر لفٹ میں سے بُو کے جھلاتی سیٹیاں بجاتی نکلی اور اپنے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھما دی.. امریکہ میں اپنے ذاتی فلیٹ میں داخل ہونا یکدم ایک ہول سے ایک خوف سے دوچار ہونا ہوتا ہے کیونکہ آپ باہر کی گہما گہمی اور زندگی کے شور کی قوت میں سے یکدم الگ ہو جاتے ہیں اور فلیٹ کے اندر ایک خاموش کھا جانے والی ویرانی کا راج ہوتا ہے.. لیکن آج میں اس ویرانی کا بھی سامنا کر سکتی تھی.. میں نے ابھی چابی پوری طرح نہیں گھمائی تھی کہ مجھے فلیٹ کے اندر مسلسل بجتی ٹیلی فون کی گھنٹی کی مدھم سی آواز سنائی دینے لگی.. میں نے تالہ کھلتے ہی دروازے کو کندھے سے دھکیلا اور بھاگ کر رسیور اٹھالیا..

میری ماں تھی..

میں نے اپنی ماں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ مجھے خواہ مخواہ فون نہ کیا کرے.. صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ بیٹی تم کیسی ہو.. کب واپس آرہی ہو.. کھانا کھا چکی ہو یا نہیں.. میرے دیئے ہوئے قرآن کا کوئی ورق پڑھا ہے کہ نہیں.. اس قسم کی بے مقصد باتوں کے لیے مجھے فون نہ کیا کرے.. اور اس نے ایک عرصے سے ایسا نہیں کیا تھا.. تو اس کی آواز سن کر ایک اہال سا اٹھا.. تشویش کا ایک مرغولا سا گھونٹ لگا کہ میری ماں نے اگر فون کیا ہے تو کچھ ہوا ہے..

”ظفر مر گیا ہے..“ لاچار بھرائی ہوئی آواز میں اس نے صرف اتنا کہا..

ایک فلمی منظر کی طرح رسیور میرے ہاتھ سے گر گیا.. اور جو بُو کے میں نے کسی کے لیے بھی نہیں خریدا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر بکھر گیا.. میں بھی شاید مر گئی تھی اس لیے کہ میں ظفر سے محبت کرتی تھی..

تھی۔ ایئر پمپ اور ڈسٹ مولاٹ کے ساتھ 'پچھلا ناز' جتنی تیزی سے گھومتا لائٹ اتنی ہی تیز اور روشن ہوتی تھی... پچھلے مذگارڈ پر سرخ اور زرد گول گول ریفلیکٹر لائٹس.. ہینڈل پر ایستادہ پلاسٹک کے پھولوں کا چپ گلہ ستہ جس پر دھول جی ہوتی تھی.. اس کے آگے بید کی آف وہاٹ نازک سی نوکری جو ہمیشہ ڈھلکی رہتی... وہ اتنی نازک تھی کہ بابا اس میں بہت کم کوئی چیز رکھتے کہ کہیں اسکے وزن سے وہ مزید نہ ڈھلک جائے۔ خراب نہ ہو جائے.. ہینڈل بار میں طرح طرح کے چوکور اور بیضوی آئینے کسے ہوتے تھے.. گھنٹی کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں اپنے چہرے کی مسرت اور بے پایاں لطف کو انہی آئینوں میں دیکھتی تھی.. ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے وہ پوے پانچ روپے الگ کرتے... اپنے گھسے ہوئے تلووں والے شوز کے لیے نہیں اور نہ ہی ایک نئی عینک کے لیے بلکہ سائیکل کی آرائش کے لیے... وہ اس روز سکول سے لوٹے تو ان کا چہرہ دمک رہا ہوتا.. وہ گھر میں داخل ہو کر گڈی کو گرفت میں لیکر سائیکل کو ذرا اوپر اٹھاتے اور دائیں پاؤں سے پچھلے ناز کے درمیان میں معلق سٹینڈ پر بوجھ ڈال کر اسے نیچے کر کے سائیکل کو کھڑا کر دیتے.. اور پھر میری جانب نکلے لگتے 'پراشتیاق اور داو طلب نگاہوں سے صرف میری طرف دیکھتے کہ صرف میں تھی جو ان کی ہمارا تھی.. میں نہایت سنجیدہ اور پر تحقیق چہرہ بنائے سائیکل کی ایک ایک چیز کو نظر سے گزارتی جاتی اور پھر یکدم کسی ایسے پلاسٹک کے پھول 'سکر یا آئینے پر ٹھہر جاتی جو پہلے وہاں نہیں تھا اور میں شرارت سے بابا کو دیکھتی اور ان کا چہرہ اس تشویش سے بھر جاتا کہ کہیں میں نے ان کی پانچ روپے سے حاصل کردہ تازہ ترین آرائش مس تو نہیں کر دی.. اور جب میں کھلکھلا کر ہنس دیتی تو ان کی جان میں جان آتی اور پھر ہم دونوں باپ بیٹی دیر تک اس نئے پھول یا سکر یا آئینے کو ایک انمول خزانے سے کہیں بڑھ کر محبت اور چاؤ سے دیکھتے رہتے...

میری ماں 'ایک غصیلی طبیعت کی عورت.. معاشی مسائل نہ بھی ہوتے تو بھی وہ اسی طبیعت کی ہوتی.. بابا اور میرے اس مشترکہ سائیکل افیئر کو سخت ناپسندیدگی سے دیکھتی اور جانے کیا بڑبڑاتی رہتی..

اتوار کے روز چھٹی ہوتی اور وہ مجھے اٹھا کر سائیکل کے آگے درمیانی راڈ پر نصب ایک چھوٹی سی گڈی پر بٹھاتے جو انہوں نے صرف میرے لیے وہاں لگوائی تھی.. ایک پرانے دسترخوان میں تین روٹیاں 'اچار کی پھاٹکیں اور دو ابلے ہوئے انڈے باندھ کر انہیں اپنی

لاڈلی بید کی نوکری میں رکھتے اور ہم دونوں سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی سرخوشی میں مست اور لپکتے ہوئے.. اوڑک جانے والی سڑک پر روانہ ہو جاتے.. بابا پر جوش انداز میں ہینڈل مارتے ذرا آگے جھک کر کوئی قصہ کہانی شروع کر دیتے.. جب ان کا خلعی خانہ بدوش باپ انہیں دیئے کی روشنی میں کتابوں اور کاپیوں پر مسلسل جھکا دیکھتا تھا اور اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس کا یہ بیٹا اونٹوں اور خیموں کی بجائے کاغذوں میں کیوں گم ہوتا ہے.. یا جب وہ میٹرک میں پاس ہوئے تھے تو ان کے قبیلے والے یہ فیصلہ نہیں کر پارہے تھے کہ انہیں جشن کرنا چاہیے یا سوگوار ہونا چاہیے.. اور جب انہیں شہر میں ملازمت ملی تھی اور انہوں نے ایک شہری لڑکی اس کی ماں سے شادی کر لی تھی.. اور جس روز میں پیدا ہوئی تھی تو چلتن کی پہاڑیوں کے رنگ کیسے گلابی ہو گئے تھے.. اور بابا اس کہانی میں اپنی طرف سے تب تک اضافہ کرتے چلے جاتے جب تک کہ سڑک حنا جھیل کو دائیں ہاتھ پر فراموش کرتی ہوئی اوڑک کے سیبوں کے گھنے باغوں کے اندر تک نہ چلی جاتی..

اور پھر ان میں سے کوئی ایک باغ ہوتا جو ماموں فقیر اللہ نے اس برس ٹھیکے پر لیا ہوتا اور وہیں.. ظفر ہوتا..

وہ درختوں کی جڑوں کو ایک دوسرے سے ملائی برفانی پانیوں کی نالیوں میں سے ریت نکالتا ان کے راستے میں مٹی کے ڈھیر حائل کرتا ان کے رخ ایسے بدلتا کہ وہ باغ کے آخری درخت کو بھی سیراب کریں.. چھینے اڑاتا ظفر ہوتا..

وہ تقریباً میرا ہم عمر تھا..

مجھے شلووار کے اوپر اس کے سفید ننگے بدن کا ایک ایک رول اور نل یاد ہے..

ابھی شاہانہ پیدا نہیں ہوئی تھی..

باغوں کے اندر پکے ہوئے سیبوں اور پانیوں کے بہنے کی جو ٹھنڈی مہک ٹھہری ہوتی تھی.. اس نے امریکہ میں بھی میرا پیچھا کیا..

بابا کی سائیکل کی گھنٹی نے.. ظفر کی شلووار کے اوپر جو اس کا سفید بدن تھا اور سیبوں کے رس نے اور انہیں رس بھرا بنانے والے پانیوں کی مہک نے امریکہ میں مجھے ایک مجرم کی شرمندگی سے دوچار رکھا..

پہلا اتوار تھا جب میں چھٹی جماعت میں گئی تھی.. میں بستر میں لیٹی بابا کی گھنٹی کی

منتظر رہی.. کب اس کی ٹنن ٹنن کی آواز آئے اور میں چھلانگ لگا کر چارپائی سے اتروں اور تیار ہونے لگوں..

مجھے چھلانگ لگا کر اپنے بستر سے باہر آنا تھا.. منہ ہاتھ دھونا تھا.. تین روٹیاں اچار کی پھانکیں ابلے ہوئے دو انڈے ایک دسترخوان میں بندھے بید کی نوکری میں.. اور ٹنن ٹنن اوڑک جانے والی سڑک.. جس کے آخر میں سیبوں کے بوجھ سے کھڑے ہونے والے درخت اور ان کے نیچے نالیوں میں چھینٹے اڑاتے ظفر کو ہونا تھا..

میں نے انتظار کیا.. ماں گہری گھوک نیند میں تھی اور بابا کروٹیں بدل رہے تھے ”بابا یہ نہیں ہو گئی؟“

”آج نہیں جانا بیٹی..“ عجیب دکھ ان کی آواز کو بٹھاتا تھا..

”لیکن کیوں بابا.. آپ بیمار ہیں؟“

”نہیں..“

”تو پھر کیوں نہیں جانا بابا..“

”تم اب بڑی ہو گئی ہو..“ انہوں نے ایک اور کروٹ بدلی اور منہ پرے کر لیا.. ہمارے گھر کی کچی دیواریں اس اتوار کے بعد ذرا اونچی ہو گئیں.. اور ان کے آگے اور دیواریں وجود میں آ گئیں.. دروازے کے آگے ایک کھلا دروازہ تھا اس پر بھی پردہ پڑ گیا.. ان کے پار جانے کی اجازت اب مجھے نہ تھی..

ظفر دو چار ماہ بعد ماموں فقیر اللہ کے ہمراہ ہمارے گھر آتا.. لیکن اب اس کا گورا اور کوئل سینہ ڈھکا ہوتا اور وہ چارپائی پر سر جھکائے بیٹھا رہتا.. نظریں نیچی کئے جیسے اس کے پونے پتھر کے ہو گئے ہوں اٹھ نہ سکتے ہوں.. میں اپنے آپ کو ماں کی ہدایت کے مطابق لپیٹ لپٹ کر ایک مردے کی طرح ڈھکی ہوتی صرف ماموں کو سلام کرنے کے لئے کوٹھڑی میں سے باہر آتی اور پھر کھڑے کھڑے واپس چلی جاتی.. ذرا سی تاخیر ہوتی.. سلام کے بعد ذرا اساد قند آتا اور میں صرف ایک نظر سر جھکائے زمین کو گھورتے ظفر کو دیکھتی تو اسی لمحے شاہانہ کو گود میں سنبھالتی ماں کی غصیلی آواز آ جاتی ”سلطانہ..“ اور میں اندر چلی جاتی..

وہ دیواریں اور پردے ہر نئے دن کے ساتھ دہنیر اور اندھے ہوتے گئے.. بابا مجھے خود سکول چھوڑنے جاتے اور چھٹی ہوتی تو ان کی بجی ہوئی سائیکل کے راڈ پر نصب چھوٹی سی

گدی میرے بیٹھنے کی منتظر ہوتی.. لیکن اب میں اس پر آسانی سے نہیں بیٹھ سکتی تھی.. وہ بہت چھوٹی رہ گئی تھی اور میرا بدن اس سے بڑا ہو گیا تھا.. اور پھر میں بڑی کلاسوں میں ہونے لگی اور بابا مجھے لینے آتے تو وہ میرا ہاتھ چوم کر سائیکل کے ہینڈل کو تھام کر پیدل چلنے لگتے اور میں سفید چادر میں گھونگھٹ نکالے ان کے برابر میں ٹھوکریں کھاتی چلتی جاتی اور اس مختصر سی گدی کو تکتی رہتی اور مجھے یقین نہ آتا کہ کبھی میں اس پر بھی پوری آ جاتی تھی.. بابا کی سائیکل بہت پرانی ہو گئی تھی..

ماں نے بہت مخالفت کی.. تین دن بابا کو کھانے کے لئے کچھ نہ دیا.. پھر بھی انہوں نے میٹرک کے بعد مجھے کالج میں داخل کر دیا..

وہ دیواریں اور پردے میرے وجود کا ایک حصہ بن چکے تھے.. اور ان کے پار کبھی کبھار مجھے ظفر کی جھلک نظر آ جاتی جس نے تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر اب فروٹ مارکیٹ میں آڑھت کا کاروبار شروع کر دیا تھا..

ایم اے معاشیات میں.. میں نے پورے صوبے میں ٹاپ کیا..

دوسرے صوبوں میں طالب علم خواب دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی غیر ملکی سکالرشپ نصیب ہو جائے لیکن ہمارے ہاں سرکاری دفاتر میں.. چیف منسٹر اور سیکرٹریز کی میزوں پر ایسے سکالرشپ پڑے پڑے آؤٹ ڈیوٹ ہو جاتے ہیں کیونکہ مراعات یافتہ طبقے کے بچے پڑھائی سے دور بھاگتے ہیں اور ہم جیسوں کی پسماندگی میں سے کوئی نکل ہی نہیں سکتا جو ان سکالرشپس پر اپنا حق جتا سکے..

ماں نے پھر بھر پور مخالفت کی.. نہ صرف بابا کو بلکہ مجھے بھی کئی روز کھانے کے لئے کچھ نہ دیا.. چو لہا گرم نہ کیا اور ہم افغانی تندور سے روٹیاں لا کر اچار سے کھاتے رہے.. شاہانہ ابھی ہائی سکول میں تھی..

انہی دنوں بابا ریٹائر ہو گئے.. ”میں ایک نئی سائیکل بھی نہیں خرید سکتا“ انہوں نے اس شام میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا ”ساری عمر کی ٹیپنگ کے بعد اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے.. نہ کچھ سامنے نظر آتا ہے.. تم جاؤ.. پی ایچ ڈی معمولی بات نہیں ہوتی.. ہمارے خاندان میں تو کیا اس پورے علاقے میں کوئی بلوچ لڑکی ایسی نہیں ہے جس نے ڈاکٹریٹ کی ہو.. تم جاؤ.. لیکن واپس آ جانا“

تھا۔ مجھے قلق ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آخری بار ہوا ہے اور اس کے بعد فنا ہے یہ دوبارہ نہیں ہوگا۔ امریکہ میں پہلے چند ماہ تو شدید مغائرت، گھر کی اداسی اور رشتوں سے بچھڑنے کے رنج میں گزرے۔۔۔ ہمہ وقت میرے کانوں میں بابا کی سائیکل کی گھنٹی بجتی رہتی۔۔۔ مجھے نیند نہ آتی۔۔۔ اور آدھی رات کو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور میرے ہوش کے کمرے میں سیبوں کی مہک رچی ہوتی۔۔۔ جیسے میرا ہیڈ اوڑک کے کسی درخت تلے بچا ہے۔۔۔ ماں کا چہرہ۔۔۔ غصیلا، دکھ بھرا ہر دم نظروں کے سامنے آتا۔۔۔ کبھی اس کے نقش دھندلانے لگتے، آؤٹ آف فوکس ہو جاتے اور پھر میں بہت ہی ہمہ تن متوجہ ہو کر۔۔۔ امریکہ اور پاکستان کے درمیان فاصلوں کو منفی کر کے اپنے کچے گھر میں داخل ہو جاتی۔۔۔ ذہن کے لیور کو گھما کر اسے پرفیکٹ فوکس میں لے آتی۔۔۔ اور پھر رونے لگتی۔۔۔ وہاں انسان جی بھر کے رو بھی نہیں سکتا کیونکہ آپ کی کوئی کلاس فیلو بیدار ہو کر آجائے گی اور اس کا خیال ہو گا کہ تم اپنے کسی بوائے فرینڈ کی بے وفائی پر اپ سیٹ ہو۔۔۔ گھر کے لیے ماں باپ کے لیے اور مٹی کی اداسی کے لیے رونے کا، ہاں کانسیٹ نہیں ہے۔۔۔

میں ایک اجنبی قبیلے کے اجنبی رسم و رواج میں تھی۔۔۔ میری کشتی ڈوب چکی تھی اور میں تیرتی ہوئی ایک ایسے جزیرے میں جا پہنچی تھی جہاں کے لوگوں کی شکلیں اور رواج مختلف تھے، رہن سہن کے انداز عجیب سے تھے اور میں ان میں ایک گمشدہ بچے کی طرح ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی۔۔۔

تم جانتے ہو کہ انتھروپولوجی کیا ہے۔۔۔ یہی کہ آپ اپنے معاشرے اور اس کی اقدار سے اور رہن سہن سے کٹ کر اس سے سراسر مختلف قبیلے میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں۔۔۔ ان لوگوں کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ انسان زندگی کو ایک مختلف سانچے میں کس طور بسر کرتے ہیں۔۔۔ ان کے رشتوں کی نوعیت کیا ہے۔۔۔ پیدائش اور موت پر ان کے کیا رد عمل ہوتے ہیں۔۔۔ انہیں سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ کہ یہی علم انسان ہے۔۔۔ میں نے بھی اُس معاشرے کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کی۔۔۔ لیکن اپنے آپ کو ایک ریسرچ سکاڑی کی طرح الگ تھلگ ہو کر یہ مشاہدہ نہ کیا بلکہ آہستہ آہستہ میں ایک غیر محسوس طریقے سے اس معاشرے کے دھارے میں شامل ہو گئی یہاں تک کہ اس کے بہاؤ میں بے اختیار بہنے لگی۔۔۔ میں ذہنی اور بدنی طور پر اُس آبائی دھارے کو فراموش کر گئی جس میں

”اب بھی۔۔۔“ جیسے اس کی ہتک ہو گئی ہو اس نے ایسے۔۔۔ اگرچہ مسکرانے کی کوشش میں کہا۔۔۔

”اب بھی کیا؟“

”تم مردوں کو استعمال کرتی ہو؟“

”یہ تو مرد پر منحصر ہے۔۔۔“ اس نے خاور کے بازو کو دبایا ”لیکن۔۔۔ اب نہیں۔۔۔“

”اب کیوں نہیں۔۔۔“ اس کے لہجے میں ایک بچے کی رنجیدگی تھی۔۔۔

اُس پاس اور دیوار کے سائے میں کچھ چارپائی۔۔۔ اور ابھی تک زمین پر بچھے اس کھیس کے سامنے جس پر سلطانہ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ اس کے سامنے جو پہاڑیاں تھیں وہ موشیوں سے خالی ہو چکی تھیں۔۔۔ اور ان پہاڑیوں کے اندر جانے کتنے جو لیاں ابھی تک مدفون تھے۔۔۔ سائے میں جا رہی تھیں۔۔۔ ایک ایسی سنائے میں ڈوبی تنہائی تھی جو صرف کھنڈروں کے اندر جنم لیتی ہے اور وہ بھی ہزاروں برس پرانے آثار کے اندر۔۔۔

”تم سننا چاہتے ہو کہ اب کیوں نہیں۔۔۔“

”اگر تم سننا چاہتی ہو تو۔۔۔“

”میں سننا تو چاہتی ہوں۔۔۔ کسی نہ کسی کو شریک کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ اپنے لیے ہمدردی حاصل کرنے کے لیے نہیں۔۔۔ صرف اس لیے کہ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ اس طرح وقت کے بہاؤ میں بہتا ہوا اپنی جڑوں سے دور ہو جاتا۔۔۔“

میں ہمیشہ کسی بھی شے، منظر یا کسی بھی رشتے سے چاہے وہ کتنا ہی عارضی اور سرسری کیوں نہ ہو۔۔۔ جدا ہونے پر اس کی جدائی کا کرب ساتھ لے آتی تھی۔۔۔ یہاں تک کہ میں اپنی کسی من پسند خوراک کا آخری لقمہ لیتے ہوئے۔۔۔ اسے منہ تک لاتے ہوئے بھی جھجکتی تھی کہ یہ آخری ہے۔۔۔ بابا کے ہمراہ اوڑک کے باغوں میں دن گزارنے کے بعد سڑک پر آتے ہی۔۔۔ جو نہی وہ مجھے گدی پر بٹھا کر پیڈل پر پاؤں مارتے تو مجھے ان درختوں سے الگ ہونے کا قلق ہونے لگتا۔۔۔ میری ماں ہمیشہ اضطراب اور غصے کی حالت میں ہوتی تھی بہت کم پرسکون اور اطمینان میں ہوتی تھی اور جب ایسی ہوتی تھی تو جب کبھی مجھے دیکھ کر مسکراتی تھی تو اس کی مسکراہٹ ماند پڑنے سے پہلے ہی اس کے گم ہو جانے کا دکھ میرے اندر جڑیں پکڑنے لگتا

سے کٹ کر میں اور ایک اجنبی قبیلے میں نکلی تھی... اب میں ان سے جدا ہو کر ایک محفوظ فاصلے پر بیٹھ کر ان کا مشاہدہ نہیں کر رہی تھی بلکہ اس قبیلے کا ایک فرد ہو گئی تھی... ان کی طرز رہائش، اخلاقی اقدار اور زندگی کرنے کے ڈھنگ میرے اپنے ہو گئے پر ایسا نہیں کہ میں نے اپنے پس منظر اور ماضی کے رشتوں کو یکسر فراموش کر دیا... انسان تو لا شعوری طور پر ہزاروں برس کی اجتماعی یادداشت کو بھی نہیں بھلاتا... بس یہ تھا کہ سائیکل کی گھنٹی کی آواز جب کبھی سنائی دیتی تو پہلے کی طرح میرے کانوں کے پردوں اور احساسات پر حاوی نہ ہوتی... بہت دور کسی گہری غار کے اندر ملفوف سنائی دیتی... اور سیبوں کی جو مہک تھی وہ میری ذریعہ نگاہ پر آراستہ یوڈی کولون اور پرفیوم کی بوتلوں میں مکس اپ ہو جاتی اور میں کوشش کے باوجود اسے الگ کر کے سو گئے نہ سکتی... ان کا وجود تھا لیکن ایسے دھند لکوں میں گم ہو گیا تھا جن تک میری رسائی نہ ہو سکتی تھی... جیسے مدتوں پہلے مر جانے والے ایک عزیز کی یاد ہوتی ہے... وہ بدن کے نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں مقیم تو ہوتی ہے لیکن وہ لمحہ موجود میں آپ کی زندگی پر کہیں اثر انداز نہیں ہوتی... میرا قبیلہ بنی اسرائیل کے گمشدہ قبیلے کی مانند یاد کے صحرائے سینا میں کہیں تھا تو سہی لیکن میں اس سے جدا ہو کر ایک اور قبیلے کا فرد بن چکی تھی... نہ صرف ان کے رواجوں کو قبول کر چکی تھی بلکہ انہیں مکمل طور پر اپنا کر اس میں اپنی شناخت کھو چکی تھی... خاور... وہ لوگ زندگی کا تجربہ نہیں رکھتے جو یہ کہتے ہیں کہ ماں کی شفقت اور باپ کا سایہ کبھی نہیں بھولتا... خون جوش مارتا ہے کبھی نہیں بدلتا... سب کچھ بھول جاتا ہے بدل جاتا ہے صرف انسان اس کا اقرار نہیں کرتا... میں کرتی ہوں... اور اس میں کوئی شرمندگی نہیں ہے... ڈاکٹریت کے بعد مجھے فوری طور پر اپنی ہی یونیورسٹی میں جاب آفر ہو گئی... وہاں لوگ خواب دیکھتے ہیں ایسی اوپننگ کے اور میں نے اس کے لیے کوئی کوشش کوئی تردد نہ کیا اور جاب کی آفر میرے ہوٹل کے کمرے تک خود آ گئی... ویری لیو کر نیو... مستقبل کے وسیع اور روشن امکانات کے ساتھ... امریکہ دی لینڈ آف اپور چیونٹی... اس نے مجھے گھر بیٹھے یہ اپور چیونٹی آفر کر دی... میں پہلے سے زیادہ خود مختار ہو گئی... اپنا کماتی تھی اور بہت کماتی تھی اور اپنا کھاتی تھی...

انہی دنوں گینگ کے کسی ایک رکن کے فلیٹ میں حسب معمول کسی بہانے ایک پارٹی تھی... کہ آج فریڈی کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے... آج مہو تو... نائیجیرین کی گوری گرل

فریڈ نے اسے پہلا بوسہ دیا ہے... کیتھرین بالآخر اس مرد کو پھانسنے میں کامیاب ہو گئی ہے جو اسے گھاس ہی نہیں ڈالتا تھا... وانگ و اچانک مین کی ماں نے اسے ہانگ چوکی چائے کا پیکٹ بھیجا ہے... یا پھر کسی نے قریب آ کر یہ دریافت کر لیا ہے کہ ڈاکٹر سلطانہ شاہ کی آنکھیں نیلے کائٹیکٹ لینز لگانے کی وجہ سے اس رنگت کی نہیں ہیں بلکہ سچ سچ آئرش آنکھوں کی طرح مسکراتی اور نیلگوں ہیں... اور یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ ایک پاکستانی لڑکی کی آنکھیں نیلی رنگت کی ہوں... اور اگر یہ ہو گیا ہے تو اسی حیرت اور خوشی میں ایک پارٹی...

کسی بھی بہانے ہر شب... گینگ کے کسی بھی رکن کے فلیٹ یا گھر میں ایک پارٹی... ایک ایسی ہی پارٹی تھی۔

لیکن اس شب ہم سب... پندرہ بیس لڑکے اور لڑکیاں... سب کے سب پرو فیشنل... نیچرز... آر کی ٹیکس اور ڈاکٹرز... اس فلیٹ میں پینے کو جو کچھ موجود تھا اسے اپنے اندر انڈیلنے گئے اور کچھ زیادہ ہی ڈرک ہو گئے... اتنے زیادہ کہ دو چار ڈرکس کے بعد جو جوڑے چپکے سے کھسک جاتے تھے کسی بیڈ روم میں یا جگہ نہ ہو تو باتھ روم میں الگ ہو جاتے تھے اور کچھ دیر بعد واپس آ کر گینگ کو "ہائے ایوری باڈی" کہہ کر منہ پونچھتے بار بار لباس درست کرتے پارٹی میں پھر سے شامل ہو جاتے تھے وہ بھی اس درجے کے خمار میں آ گئے کہ بدن اور جنس کو بھی فراموش کر گئے۔

ہم سب دنیا کو برباد کر دینا چاہتے تھے۔

ہم ایسی خوشی اور مستی میں تھے کہ پورے نیویارک کو اپنے نشے سے بھل ڈوز کر سکتے

تھے۔

جب فلیٹ میں آبی ذخیرے کی ایک بوند بھی باقی نہ رہی... اور بوتلوں کو اٹھا کر ان کی پشت پر تھپکیاں دینے کے باوجود ان میں سے شراب کا ایک قطرہ بھی برآمد نہ ہوا تو ہم سب غل کرتے ایک اور بوند کے لیے پاگل ہوتے لڑھکتے اور ٹھو کریں کھاتے اور خداؤں ایسے یقین کے ساتھ کہ ہم کبھی فنا نہیں ہوں گے... فلیٹ کے نیچے آئے... جانے کیسے ففٹھ ایونیو تک جا پہنچے اور اس کے ہر شراب خانے اور ریستوران کے دروازوں کو دھکیلتے اندر داخل ہو جاتے... گرتے پڑتے شراب کی ڈیمانڈ کرتے... میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں شدید نفرت اور ناپسندیدگی سے دیکھتے لیکن ہمیں تو ان کے چہرے بھی نظر نہیں آرہے

تھے ان کی نفرت اور ناپسندیدگی کیسے نظر آ جاتی.. ہم ان کے آگے دھری ڈر نکس بھی اٹھا اٹھا کر اپنے اندر اندھ پلٹے گئے.. کہاں کہاں سے ہمیں زبردستی نہ نکالا گیا.. ویٹرز نے کسی ریستوران میں سے ہمیں دھکے دے کر نکالا.. کسی شراب خانے میں پولیس بھی آگئی تھی.. ہمیں کیا پرواہ تھی۔

ہم تو نیویارک کی تمام بلڈنگوں کو بل ڈوز کر دینے کے موڈ میں تھے.. انہیں ڈھانے کے لیے آئے تھے دنیا فتح کرنے کے لیے آئے تھے..

مجھے بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ساتویں آسمان پر ہوں یا کسی بے خود گہرائی میں گری بے تحاشہ قہقہے لگا رہی ہوں کچھ پتہ نہ تھا.. لیکن تھوڑی دیر بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں پیو منٹ پر اکیلی کھڑی ہنس ہنس کر دوہری ہوتی چلی جاتی ہوں اور جس امریکی لڑکے نے مجھے میرے فلیٹ پر ڈراپ کرنا تھا وہ کہیں اس پاس دکھائی نہیں دے رہا.. شاید وہ کسی گٹر میں گر گیا ہے کسی ٹرام کے نیچے آ گیا ہے یا کسی ہسپتال میں ہے کچھ پتہ نہ تھا۔

صرف میں تھی.. اور فٹ پاتھ پر اکیلی کھڑی لڑکھڑاتی قہقہے لگا رہی تھی.. انجائے کر رہی تھی۔ میری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا.. کبھی میں ہنستے ہنستے دوہری ہو کر گھٹنوں پر ہاتھ رکھتی تو وہ ہاتھوں کا بوجھ نہ سہار سکتے اور میں گر جاتی.. اور گر کر پیو منٹ پر ناگلیں پھیلائے لیٹ جاتی اور اسے چوم کر بار بار ”ہیلو“ کہتی.. لیکن پیو منٹ کے پتھر جواب نہ دیتے اور میں ناراض ہو جاتی۔ میں آخری بار گری تو وہ ہیں فٹ پاتھ پر سو جانا چاہتی تھی لیکن میرے اندر کہیں خطرے کی کوئی گھنٹی بجتی تھی۔ شاید میرے بابا کی سائیکل کی گھنٹی تھی جو کہتی تھی ”اٹھو.. تم نے گھر جانا ہے.. اٹھو.. اور میں گرتی پڑتی ڈولتی اور کبھی دو چار قدم آگے اور کبھی پیچھے ہوتی کسی نہ کسی طرح پھر سے کھڑی ہو گئی لیکن میرے قہقہے تھمنے میں نہ آتے تھے.. جب میں پیو منٹ پر گرتی تھی تو ناگلیں پھیلانے سے وہ کولہوں تک برہنہ ہو جاتیں.. کیونکہ میں شلوار قمیض کو ایک عرصے سے ترک کر چکی تھی اور اب ایک لمبا سکرٹ پہنتی تھی.. لیکن کسے پرواہ تھی وہ پہلی بار تو برہنہ نہیں ہوئی تھیں..

تم نے گھر جانا ہے.. تم نے گھر جانا ہے.. گھنٹی مجھے خبردار کرتی رہی..

”ٹیکسی۔ ٹیکسی“ میں جو بھی کار گزرتی دیوانہ وار دونوں ہاتھ لہراتی اس کے سامنے آ جاتی اور اسے روکنے کی کوشش کرتی.. پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور میں وہیں فٹ پاتھ

پر کھڑی پاتھ بلاتی ”ٹیکسی ٹیکسی“ پکارتی رہی.. بالآخر ایک ٹیکسی کہیں سے نمودار ہوئی اور فٹ پاتھ کے کنارے کے ساتھ آگئی.. میں نے اس کے پیچھے دروازے کے ہینڈل کو ہمشکل اپنی آنکھوں سے فوکس میں کیا کیونکہ ہر شے دوہری تہری اور دھندلائی ہوئی نظر آرہی تھی.. اور جب وہ ہینڈل تین ہینڈلوں کی بجائے ایک میں سمٹ کر آیا تو میں نے اپنی تمام تر توجہ اس پر مبذول کی بار بار اپنے آپ کو کہا کہ سلطانہ یہ ہینڈل ہے.. تم نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا ہے اور اسے کھینچ کر دروازہ کھول کر ٹیکسی کے اندر جانا ہے....

مجھے اصولاً تو اس لمحے اتنی رات گئے نیویارک شہر میں ایسی حالت میں کسی بھی ٹیکسی پر سوار ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا لیکن اس لمحے میرے لیے نہ تو کوئی اصول تھا اور کوئی دن تھا اور نہ کوئی رات تھی اور میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا جو پہلے سے بگڑا ہوا نہیں تھا۔

میں پچھلی نشست پر جھول کر گری اور پھر سر جھٹک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور سو رہنے کی کوشش میں مسکرانے لگی..

ٹیکسی ڈرائیور نے مجھ سے وہ سوال نہیں کیا جو وہ ہر سواری سے کرتے ہیں کہ مینم آپ کہاں جائیں گی۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی ٹیکسی سٹارٹ کر دی اور اپنا بیک ویو مرر ایڈجسٹ کیا اور مائنڈ یو اس کے ساتھ مرجھائے ہوئے موتیے کے پھولوں کا کوئی ہار نہیں لگاتا تھا..

وہ کوئی سیاہ بالوں والا نہایت ہینڈسم شخص تھا میں اس کے سر کے پیچھے حصے سے اندازہ لگا سکتی تھی۔

اس کے ڈیش بورڈ پر ایک چمکیلا فلوروسنٹ سکر چسپاں تھا جس پر جب کبھی پیچھے سے کوئی کار آتی تو اس کی لائٹس سے وہ اتنا روشن ہو جاتا کہ میری آنکھوں میں چھینے لگتا۔ میں آنکھیں میچ کر اسے پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی عبارت دوہری تہری ہو کر گڈمڈ ہو جاتی.. نا آشنا سے لفظ تھے جو میری آنکھوں کے سامنے رکتے نہ تھے اور خمار کے باعث مسلسل حرکت کرنے لگتے تھے۔

وہ بہت ہینڈسم اور بہت چپ تھا اور بالکل خاموشی سے ایک فرض کی ادائیگی کی طرح ٹیکسی ڈرائیور کر رہا تھا.. میں نے کچھ لمحے تو صبر کیا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر

ایک مکمل طور پر نشے میں ڈھت شخص کے ساتھ اگر آپ کچھ دیر بات نہ کریں تو وہ روٹھ جاتا ہے۔ خاموشی کو اپنی بے عزتی سمجھتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جو چپ ہے میرے خلاف ہے اور مجھے پسند نہیں کرتا۔ اسی لئے میں نے اس کی خاموشی کو پسند نہ کیا اور پھر اس کے کندھے کو تھپک کر کہا ”مسٹر.. آئی ایم ناٹ سٹوپیڈ.. مجھے پتہ ہے کہ تم مجھے بیک ویو مر میں دیکھ رہے ہو.. ڈونٹ یو تھنک آئی ایم پریٹی..“

”یو آر مسٹر..“

میں اس کا سر توڑ دینا چاہتی ہوں.. پھر وہی مسٹر.. لیکن ٹیکسی رک رہی تھی۔ ٹیکسی رکی اور میں نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ مارا.. اور وہ نہیں کھل رہا تھا۔ شاید اس ٹیکسی میں فیکٹری والے وہ لیور لگانا بھول گئے تھے جسے دبانے سے دروازہ کھلتا تھا۔ اس نے سیاہ بالوں والے ڈرائیور نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر اپنی نشست سے باہر آ کر دروازہ کھول دیا..

”تھینک یو..“ میں باہر نکلی اور گرتی گرتی بچی.. ”ہاؤج؟“

اس نے کرائے کی کوئی رقم بتائی.. اور میں نے اپنا پرس کھول کر جسے حیرت انگیز طور پر میں ابھی تک تھامے ہوئے تھی وہ رقم یا اس کے لگ بھگ کچھ ادائیگی کر دی اور پھر ایک دس ڈالر کا بیل اس کی جانب اچھال دیا.. اس سیاہ بالوں والے احمق نے اسے ہوا میں گرتے ہوئے فوراً اسے اپنی ہتھیلی کا سہارا دے کر دبوا چاہا.. اسے فٹ پاتھ پر گرنے دیا..

”اس اٹھالو مسٹر.. یہ تمہارا ٹپ ہے“

وہ نہایت تحمل سے جھکا اور نوٹ اٹھالیا..

”تمہیں پتہ ہے کہ میں یہ ہیوی ٹپ تمہیں کیوں دے رہی ہوں..؟“

”کیوں؟“ اس نے نظریں جھکائے اسی تحمل سے پوچھا..

”صرف اس لئے کہ آئندہ تم کسی باعزت عورت کو سسٹر نہ کہو..“

میں نے اپنی لپار ٹمنٹ بلڈنگ کی طرف دیکھا تو وہاں موجود نہ تھی.. مجھے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ صرف ایک دھند تھی جس میں اب پیٹ کے اندر ایک مٹلی کا احساس ابھرتا تھا.. میں اپنے آپ کو سنبھالتی میرے گھٹنے بھڑتے اور ٹانگوں میں جان نہیں تھی.. میں ڈولتی ہوئی اس دھند کی طرف بڑھنے لگی۔

کہا ”تم اتنے سوبر کیوں ہو؟ کیا کوئی مر گیا ہے..“

”نہیں سسٹر..“ اس نے پیچھے دیکھے بغیر آہستہ سے کہا..

سسٹر.. یہ اس نے کیسا لفظ بولا ہے.. ”کیا تم نے مجھے یہ کہا ہے.. سسٹر؟“ میں پھر ہنستے ہنستے دوہری ہو کر نشست پر گر گئی بلکہ لیٹ گئی اور پھر بڑی مشکل سے اٹھ کر پھر اس کے کندھے کو تھپکا ”کیا میں ٹھیک سن رہی ہوں؟ تم نے مجھے سسٹر کہا؟“

”ہاں سسٹر..“

میں یکدم طیش میں آ گئی.. ”ہے سسٹر فکر.. دہاٹ دے فلنگ ہیل آر یو ٹانگ اباؤٹ.. ہے مین.. میں کسی کی سسٹر نہیں ہوں.. آئی ڈونٹ ہیو اے برادر.. تم سن رہے ہو.. تم نے میری بے عزتی کی ہے.. مجھ سے معافی مانگو..“

”آئی ایم سوری سسٹر..“

”میں تمہیں جان سے مار دوں گی اگر تم نے پھر مجھے سسٹر کہا تو.. مجھے کسی بھائی کی ضرورت نہیں.. تم ٹیکسی روکو.. میں اترنا چاہتی ہوں.. روکو.. ورنہ میں شور مچا دوں گی..“

”سوری.. آپ مجھے معاف کر دیں.. پلیز ٹیٹھی رہیں..“ اس نے پیچھے مڑ کر پھر بھی نہیں دیکھا بس ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے یہ کہتا رہا..

”او کے..“ مجھ میں سکت بالکل نہ رہی تھی.. اور میں گھر بھی پہنچنا چاہتی تھی

”ٹھیک ہے.. ڈرائیو آن..“

مجھے نیویارک کے ٹیکسی ڈرائیوروں کا ایک وسیع تجربہ تھا..

اگر وہ تھارو بریڈ امریکی گورا ہے تو وہ آپ سے منزل کا پتہ پوچھنے کے بعد چپکے سے ڈرائیو کرتا چلا جائے گا.. اسے ایک غیر ملکی چہرے کو پچھلی نشست پر دراز ہو کر اس کا عارضی آقا ہو جانا اچھا نہیں لگے گا.. اگر وہ ایک ایفرو ہے یا پورٹو ریکین ہے تو وہ بیک ویو مر میں تمہیں دیکھتے ہی فلرٹ کرنے لگے گا.. اور اگر وہ پاکستانی ہے تو یقیناً اس کا میٹر تیز ہو گا اور وہ بہت مودب ہو گا اور باجی آپ کو یہاں کتنا عرصہ ہو گیا ہے.. گرین کارڈ مل گیا ہے یا نہیں.. میرا ایک دوست اپنے لپار ٹمنٹ میں پاکستانی کھانے بناتا ہے.. چکن بریانی اور کو فٹے.. دیری چپ.. میں اس کا کارڈ آپ کو دیتا ہوں.. ہوم ڈیلیوری اور حلال میٹ.. ٹرائی کریں باجی..

لیکن یہ ڈرائیور کسی اور ہی قومیت کا تھا جس کے مزاج کو میں نہیں جانتی تھی..

”تم اپنے اپارٹمنٹ تک نہیں پہنچ پاؤ گی سسر۔۔“ پیچھے سے اس کا ہاتھ میرے کمر کو تھامنے کے لئے آیا ”میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں“

میں اب احتجاج کرنے کے قابل نہیں تھی۔۔ لیکن اس نے مجھے سہارا دیا تو میں نے اپنا سارا بے اختیار بوجھ اس پر ڈال دیا اور پھر مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا ”اے سسر۔۔ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو۔۔ میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں“

وہ ایک ذاتی ملازم کی طرح میری دیکھ بھال کرتا۔۔ مجھے سنبھالتا مگر میرے بدن سے بچتا مجھے میرے اپارٹمنٹ تک لے گیا۔۔

اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں نے اپنے پرس میں سے ایک چابی تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ وہاں نہیں تھی۔

”یہ مجھے دیجئے۔۔“ اس نے نہایت احتیاط سے پرس میرے ہاتھوں میں سے لے لیا اور میں بڑبڑاتی رہی ”پرس سنچر۔۔ میں پولیس کو بلا لوں گی۔۔ میرا پرس واپس کرو“ لیکن اس نے دھیان نہ دیا اور چابی نکال کر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھول دیا۔۔ دروازے کے ساتھ ہی میں اندر لڑھک گئی۔۔ وہ باہر کھڑا ہا۔۔ میں نے دروازہ اس کے منہ پر مار کر بند کرنے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ کہیں اور جا لگا اور میں اپنے ہی بے اختیار زور میں فرش پر گر گئی اور پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی اٹھنے سے لاچار ہو گئی۔۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا ”وہاں کھڑے کیا دیکھ رہے ہو سسر فکر۔۔ میری مدد کرو“ میں نے بازو اٹھا کر کہا۔۔

وہ اندر آیا۔۔ ایک احتیاط پسند جھجک کے ساتھ میرے بدن کو سمیٹ کر اٹھایا اور مجھے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔۔ اور پھر منہ موڑ کر جانے لگا تو میں نے پکار کر کہا اگرچہ میں مکمل خمار سے بھی کہیں آگے کی منزلوں پر تھی مگر مجھے ایک ایک لفظ یاد ہے۔۔ ”ہے سسر۔۔ تم مجھ میں۔۔ میری باڈی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔۔ آریو ڈمب؟“

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔۔ وہ بلاشبہ ذہنی طور پر ماؤف تھا۔۔ ڈمب تھا۔۔ اور وہ مجھے ٹھیک طرح سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔۔ وہ اس لمحے کوئی جانور بھی ہو سکتا تھا۔۔ کوئی بھیڑیا۔۔ کوئی گیدڑ۔۔ یا کوئی انسان بھی۔۔ اگر نظر کچھ نہ آئے تو کوئی شے کچھ بھی ہو سکتی ہے۔۔ انسان اور حیران میں فرق نہیں رہتا۔ اس کی شکل نشے میں فرق ملا دیتی ہے۔۔ میں پھر سے ہنسنے لگی۔

”ہے ڈونٹ بو تھنک مائی باڈی از بیوٹی فل۔۔“ میں نے جان بوجھ کر اپنے لمبے سکرٹ کو کولہوں تک سمیٹ کر بے خودی کی ترنگ میں کہا۔۔

”یو آر بیوٹی فل۔۔ سسر۔۔“ اس کا لہجہ میں نے پہلی بار محسوس کیا اٹالوی قسم کا تھا جو بیوٹی فل کو بیوٹی فل کہتا تھا۔

اس کے سسر کہنے پر میں پھر بگڑ گئی ”ہولی شٹ۔۔“ میں نے سر جھٹک کر کہا ”تم ہو کون۔۔ پورٹوریکین۔۔ اٹالین۔۔ وہاٹ شٹ آریو؟“

”آئی ایم این ایرامین سسر۔۔“

”اوہ۔۔“ مجھے شدید متلی ہو رہی تھی میرے پیٹ میں جتنا بھی مختلف اقسام کا الکو حل کس اپ تھا وہ میرے گلے کے راستے باہر آنے کو زور کرتا تھا اور منہ پر ہتھیلی جمائے اسے روکنے کی کوشش کرتی تھی ”تم ایرانی ہو؟“

”یس سسر۔۔“

”ہے۔۔ ہم تو ہمسائے ہیں۔۔“ میں خوش ہو گئی ”ٹھیک بینڈز۔۔ آئی ایم فرام کوئٹ۔۔ بلوچستان۔۔ پاکستانی بلوچستان۔۔ دوئی آر نیکیسٹ ڈور نیبرز۔۔ ٹھیک بینڈز“ میں نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اور وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ شاید میں ہاتھ نیچے کر لوں اور پھر جیسے وہ ایک فرض ادا کر رہا ہوں اس نے میرا ہاتھ چھوا اور پیچھے ہو گیا۔۔

اور اس لمحے اس کی ٹیکسی کے ڈیش بورڈ پر چسپاں جو سکر تھا جس پر پیچھے سے آنے والی ٹریفک کی لائینیں پڑتی تھیں تو وہ چمک کر میری آنکھوں کو دکھ دیتا تھا وہ سکر میرے خمار آلود دماغ میں تیرنے لگا۔۔ اس پر کیا لکھا تھا جو مجھ سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔۔ ”تم مجھ سے ٹھیک طرح سے ہاتھ نہیں ملاتے۔۔ نہ سہی۔۔ لیکن تمہارے اس سکر پر کیا لکھا تھا۔۔ آئی ٹو میڈ ونا۔۔ آئی ٹو فری سیکس۔۔ یا آئی وائٹ ٹو میک یو پریکٹ تو نہیں لکھا تھا کہ کچھ اور لکھا تھا۔۔ کیا لکھا تھا۔۔“

وہ دھیمے سے ایک خاص شرمندگی سے مسکرایا۔۔ اور اپنے گھنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا ”وہ۔۔ کلمہ شریف کا سکر ہے۔۔ سسر۔۔“

”وہاٹ؟“ میں نے بستر پر سے اپنے اوندھے پن سے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر سے ڈھیر ہو گئی۔۔ اور پھر ڈولتی ہوئی اپنی کہنیوں کے سہارے اٹھ کر بیٹھ گئی ”تم ان چیزوں پر یقین رکھتے ہو؟“ اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔۔ نظریں نیچی کئے کھڑا ہا۔۔

ابھی تک بستر پر بکھری پڑی تھی۔ اب میں نے کہنیوں کے سہارے اپنے آپ کو اٹھایا اور ٹانگیں سمیٹ کر آلتی پالتی مار کر کر مہا تباہ کی طرح بیٹھ گئی۔ ہر خواہش کو پورا کرنے والے بدھ کی طرح اور بولتی گئی۔ ”ہاں تو دُاؤں گائے۔ تم کیسے جانتے ہو کہ میں۔۔ اوہ ہاں۔۔ یہ تو بہت ہی آسان ہے“ میں نے اپنے گلے کے گرد انگلیاں پھیریں تو لاکٹ ابھی موجود تھا۔ تم نے اس لاکٹ پر جو ”اللہ“ لکھا ہوا ہے۔ تم نے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا ہے۔۔“

”نہیں؟“

”تو پھر تم کوئی گورو ہو۔۔ غیب کا علم جانتے ہو ایرانی برادر۔۔“

میں اگرچہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی لیکن مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ غنودگی اور ٹوٹے خمار کی بے بسی میرے اندر لہریں لیتی مجھے ڈھار ہی تھی۔

وہ بدستور اپارٹمنٹ کے کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ سر جھکائے۔۔ میری طرف دیکھتا نہیں تھا صرف سن رہا تھا۔ اور یہی تو رنج تھا مجھے۔ اپنے آپ کو بے عزت محسوس کر رہی تھی کہ وہ میری جانب اس نظر سے نہیں دیکھتا تھا جو ہر اس امریکی کی نظر ہوتی ہے جب اس کے سامنے خمار میں گم اپنے بدن سے بے خبر ایک نوجوان لڑکی ایک اپارٹمنٹ میں تنہا ایک بستر پر بیٹھی ہوتی ہے۔ بیٹھی تو ہوتی ہے لیکن اسے اگر ایک تنگے سے بھی چھو دیا جائے تو وہ لیٹ جاتی ہے۔ اس نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔

”میں ایسے جانتا ہوں کہ تم۔۔ اگرچہ ڈرنک ہو سسٹر۔۔ لیکن تم میں اب بھی ایک حجاب ہے۔۔ تم وہ بدستی نہیں ہے جو ایک عام امریکی لڑکی میں ہوتی ہے۔ تمہارا چہرہ بے حیا نہیں ہو سکتا مکمل طور پر۔۔ تم جو کر لو۔۔ تم ان کی طرح نہیں ہو سکتیں اور بے شک تمہارا سارا وجود بے حجاب ہو جائے تب بھی تمہاری آنکھوں میں ایک جھجک ہے۔ اس جھجک نے مجھے بتایا ہے کہ تم مسلم ہو۔ تم اب آرام کرو۔۔ میں چلتا ہوں“

”وہاٹ بل شیٹ۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔“ میں نے چیخ کر کہا اور اتنے زور سے کہا کہ میرے بیٹھے کا بیٹنس ڈولنے لگا اور میں اوندھے منہ گرنے لگی۔ گرتے ہوئے۔۔ جب تک میری ناک بستر کی چادر پر کریش ہو جاتی اس درمیانی مدت میں۔۔ ان لحوں میں جو بہت آہستہ آہستہ سلوموشن میں تھے۔ نشتے میں تیرتی، ہلکی ہوتی۔۔ اپارٹمنٹ کی ہر شے کے ساتھ میں بھی لڑتی پرواز کرتی تھی۔ میری سٹڈی ٹیبل پر آراستہ کتابیں ورق الٹتی تھیں

”آئی ایم آسوائے موزلم۔۔“ میں نے اپنے لمبے سکرٹ کو جو کولہوں کے اوپر تک سمٹ چکا تھا عقیدت کے اظہار کے طور پر کھینچ کر نیچے کیا اور برہنہ ٹانگوں کو ڈھانپ لیا۔ ”بٹ آئی ڈونٹ بیلو ان دس رات۔۔“

”مجھے پتہ ہے کہ آپ ایک مسلمان خاتون ہیں سسٹر۔۔“

”ہاؤ دے فلک ڈویو نو دیٹ؟“ مجھ میں بولنے کی قوت گھٹتی جاتی تھی اور میری پھولی ہوئی زبان ایک مرتے ہوئے سانپ کی دم کی طرح ہولے ہولے حرکت کرتی تھی اور لڑکھاتی تھی ”تمہیں۔۔ تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں کون سے کے ایک سکول ماسٹر کی بیٹی ہوں جس نے ایم۔اے کرنے کے بعد امریکہ۔۔ لیکن تمہیں تو یہ بھی نہیں پتہ کہ کون سے کہاں ہے۔۔ نہیں۔۔ نہیں نہیں تم جانتے ہو کہ کون سے کہاں ہے۔۔ ہم تم پر دوسری ایرانی برادر۔۔“

اس لمحے اگر وہ چلا بھی جاتا تو میں اس مقام کو گھورتے ہوئے جہاں وہ کھڑا تھا باتیں کرتی چلی جاتی۔۔ یہ میں نہیں میرا خمار بولتا تھا جسے کسی مقابل کی ضرورت نہیں تھی ”تمہیں پتہ ہے۔۔ ڈویو نو دیٹ۔۔ میں پردے میں گھر سے نکلتی تھی ایک حنوط شدہ مٹی کی طرح لپٹی ہوئی۔ ایک پارسل کی طرح پیک شدہ۔۔ بلکہ پارسل کے تو کہیں کہیں سے تناسب ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن میرے۔۔ نہیں نہیں۔۔ اور پھر سکارپٹ آگیا۔۔ میرا باپ بہت فکر مند تھا۔ بہت۔۔ میں نے سر جھٹکا۔۔ کیونکہ مجھے سائیکل کی گھنٹی سنائی دینے لگی۔ یا شاید یہ میرے اپارٹمنٹ کی بیل تھی۔۔ ہوا ز رنگنگ۔۔ یہ کون ہے۔۔ کون ہے جو گھنٹی بجاتا ہے۔۔ میں نے کان لگا کر سنا۔۔ اور پھر اس کی جانب دیکھا جو بٹ بنا کھڑا مجھے سن رہا تھا۔ اگر یہ آواز مجھے سنائی دے رہی تھی تو یقیناً اس کے کانوں میں بھی آ رہی ہوگی ہے۔ کیا تم بھی سن رہے ہو؟ غور سے سنو۔۔ کین یو ہیئر اٹ؟۔۔ میرا باپ ہمارے کچے گھر کے صحن میں داخل ہو رہا ہے اور مجھے متوجہ کرنے کے لئے سائیکل کی گھنٹی بجا رہا ہے۔۔ ٹن ٹائن۔۔ تم سن رہے ہو۔۔ نہیں۔۔ تم بہرے ہو۔۔ یو آر ڈیف ڈیف ڈیف۔۔ اتنی دے میرا باپ بہت فکر مند تھا۔ امریکہ۔۔ اکیلی لڑکی۔۔ اور مجھ میں ڈر تھا لیکن میں یہاں آئی تب مجھ پر کھلا کہ زندگی کیا ہے۔۔ وہاٹ از لائف۔۔ دس از۔۔ دس از لائف ڈیم اٹ۔۔ باقی سب بل شٹ ہے۔۔ زندگی رواجوں اور مذہبی ممبروں بڑبڑانے کا نام نہیں ہے لیکن۔۔ ہاؤ ڈویو نو۔۔ دیٹ آئی ایم اے موزلم۔۔ لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ مجھے مسلم ہونے پر فخر ہے۔۔ ہاں۔۔ آئی ایم ویری پراؤڈ ٹو بی اے موزلم۔۔“ میں

اسے اب کتنے زمانے، کتنے یگ بیت چکے تھے، 'انٹروپولوجی کی کتابوں... ریسرچ پیپر ز اور بیسٹ سیلر ناولوں کے درمیان کوئی ایک اور کتاب ہوئے... ان میں بے نام ہوئے کتنے یگ بیت چکے تھے... وہ کسی اور قبیلے کی تحریر تھی جو اب میرا نہ تھا... ہر شے پرواز کرتی تھی... متحرک اور بس سے باہر ہوتی تھی...

اور اوندھے منہ گرنے کا عمل مکمل ہوا اور میری ناک بستر کی چادر پر کریش کر گئی... میں اسی حالت میں پڑی رہی اور شاؤٹ کرنے لگی "دفع ہو جاؤ... گیٹ دے ہیل آؤٹ آٹ ہیئر... نہیں تو میں پولیس کو اطلاع کر دوں گی کہ... ایک ایر انین لیور سٹ میرے اپارٹمنٹ میں گھس آیا ہے اور... مجھے سسٹر کہتا ہے..." اور مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا میرا منہ بستر کی چادر میں دھنسا ہوا تھا اور میری پشت بلند تھی جیسے سجدے میں جانے سے ہوتی ہے اور میں بے اختیار ہنستی گئی... میری آنکھوں اور کھلے منہ سے رائیں بہتی تھیں...

وہ ابھی تک وہاں تھا... میری دھمکی کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا... وہ ذرا آگے آیا... اس کے ہاتھ میری جانب بڑھے اور وہ مجھے درجنوں ہاتھ دکھائی دیئے... شاید اب وہ میرے بدن کی کشش محسوس کرتا تھا آخر وہ مرد تھا کتنی دیر اپنے آپ کو روک سکتا تھا... اس کے ہاتھ آگے آئے... میں اوندھے منہ گری کن اکھیوں سے ان کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ مشرقی مرد کی یہ سسٹر منافقت ابھی انجام کو پہنچ جائے گی... اس کے ہاتھ آگے ہوئے اور میرے کندھوں کو تھپک کر پھر پیچھے چلے گئے... "سسٹر... تمہیں اس وقت آرام کی ضرورت ہے... سونے کی کوشش کرو... لیکن یہ زندگی نہیں ہے" اور پھر وہ پلٹ کر واقعی جانے لگا...

میں نے بمشکل اپنے آپ کو اٹھایا... اپنے آپ کو پھر سے اوندھے منہ گرنے سے بچایا "ہے دائرہ گائے... جانے سے پہلے مجھے زندگی کے بارے میں تو بتاتے جاؤ کہ یہ نہیں تو پھر کیا ہے..." اور میں پھر قہقہے لگانے لگی... میرا لباس میری طرح بے ترتیب اور خمار میں تھا اور لا پرواہ تھا کہ وہ میرے بدن کے کس حصے کو ڈھکتا ہے اور کس کو برہنہ کرتا ہے...

وہ آہستگی سے پلٹا... "سسٹر... یوں ذریعہ ہو کر تو ہر کوئی ہنس سکتا ہے... قہقہے لگا سکتا ہے... مزا تو تب ہے کہ اگر تم نے شراب نہ پی ہو... اور پھر تم ہنسو... قہقہے لگاؤ... یہ زندگی ہے" اور یہ کہہ کر وہ دروازے میں سے نکل گیا...

جیسے جیسے میری طبیعت الٹتی تھی... کھڑکی کے پردے ہلتے تھے... میرے پلنگ کے پائے ہوا کے دوش پر تیرتے تھے... سائنڈ ٹیبل پر رکھا ایک گلاس... دو گلاسوں میں بدلتا تھا... پھر تین اور پھر درجنوں گلاسوں میں بدلتا تھا... میں اگر ہاتھ بڑھا سکتی تو ان میں جو حقیقی گلاس تھا اسے نہیں تھام سکتی تھی... ٹیبل لیپ دھندلاتا تھا... سامنے تپائی پر کچی ظفر کی تصویر آؤٹ آف فوکس ہو کر کئی چہرے دکھاتی تھی 'اس کی کئی ناکیں تھیں' درجنوں آنکھیں تھیں اور تہہ در تہہ بے شمار مسکراہٹیں تھیں... وارڈروب کے کھلے دروازے میں سے میرا بلوچی ڈریس ہینگر سے جھولتا تھا اور اس پر گول شیشوں اور رنگین دھاگوں کے پیئرن جگمگاتے اور دھندلاتے تھے اور ہر چھوٹے سے شخصے میں ماضی کی شبیہیں ابھرتی تھیں، گھنٹیاں بجتی تھیں اور اپارٹمنٹ میں سیبوں کی مہک تیرتی تھی...

اور اس مغربی پہناوے میں میرا بدن آزاد اور بے پرواہ... جو کبھی ایک چادر میں دفن ایک مردے کی طرح بے جان اور بے نام تھا... تب سیبوں کی گھنٹی مہک پر ایک اور مہک حاوی ہونے لگی... الکو حل کی بوسیدہ اور بساند چھوڑتی مہک جو مجھ میں رہتی ہوئی تھی... کیلیفورنیا کے انگوروں کا خمیر... کسی پورٹ کسی مارٹینی یا رزم... یا سکاچ کی دھاریں تھیں جو سیبوں کی مہک پر حاوی ہوتی تھیں... اور بستر پر اوندھے منہ گرتے ہوئے اس بے خودی کے خلا میں تیرتے اور گرتے ہوئے میں نے ایک شیلف میں... انٹروپولوجی کی دہیر کتابوں 'ریسرچ پیپر ز اور سڈنی شیلڈن کے ناولوں کے درمیان ایک شہاب ثاقب کو چھوٹے... فضا میں تیرتے... روشنی کا جھماکا تخلیق کر کے فوراً ہی گم ہوتے دیکھا... جسے میری سخت گیرماں نے ایئر پورٹ روانہ ہونے سے پیشتر ایک سبز رنگ کے تھیلے میں لپیٹ کر میرے کپڑوں کے درمیان رکھا تھا... "بیٹی اسے پڑھا کر نا... غافل نہ ہونا..."

بیٹی نے امریکہ میں آکر بہت دنوں تک سر پر دوپٹہ اوڑھ کر اسے باقاعدگی سے پڑھا... غفلت نہ برتی... نہ سمجھتے ہوئے بھی... عقیدت کی جہالت میں... سر ہلاتے ہوئے پڑھا...

اور پھر کچھ بے قاعدگی آنے لگی... غفلت کا احساس تو تھا لیکن ایک بے نام آہستگی اور دھیرج سے... بیٹی کی روح میں آزادی داخل ہونے لگی... وہ ایک نئے قبیلے کے رسم و رواج قبول کرنے لگی اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ پرانے قبیلے کی رسمیں اور عقیدے مضحکہ خیز لگنے لگے...

اُس دن کے بعد.. آج تک میں نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔

جولیاں کی پہاڑی پر بکھرے معبد اور درس گاہ کے کھنڈر تاریکی کی گہری گچھا میں گم سکوت میں تھے.. ہوا میں جو سرد نمی تھی وہ اس اوس کی تھی جو ان کے بدنوں کو شہباز کی چارپائی کی ادوائن کو ٹھنڈ سے دوچار کراتی تھی.....

بڑے تالاب کے گرد وہ طاقے تھے جن میں نصب سا کیا منی کے بُت اب بے گھر ہو کر ٹیکسلا میوزیم کے شوکیسوں میں قید تھے اور ان کے پتھروں پر دھویں کے نشان تھے.. اور جو طالب علم اور بھکشو حبت اور چین سے آگئی حاصل کرنے کے لیے جُولیاں آتے تھے ان کی رہائشی کو ٹھڑیوں پر اب چھتیں نہیں تھیں..

گھپ اندھیرا تھا اس لیے وہ ہاتھ تھامے ہوئے چلتے تھے.. سلطانہ الگ ہوئی اور ایک کو ٹھڑی کے اندر چلی گئی..

”اس کو ٹھڑی میں کچھ دیر رہنا چاہیے.. اس میں پتہ نہیں کتنی متلاشی روحوں کے سانس ہیں.. ان سانسوں میں شاید وہ جواب ہوں جن کی میں متلاشی ہوں.. میں موت کی ماہیت کو سمجھ نہیں سکتی.. ایرانین برادر نے زندگی کی جو توجیہ کی تھی اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا تھا.. لیکن کیا بس یہی توجیہ ہے.. میں ابھی تک اندھیرے میں ہوں۔“

خاور نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو وہاں ایک تاریک آسمان تھا لیکن اس تاریکی میں بجھتے ہوئے نیم روشن ستارے نمایاں ہوتے تھے۔

سلطانہ کی ان نیلگوں آنکھوں میں جن میں ایرانی برادر کو ایک جھجک نظر آئی تھی ان میں کوئی ایک ستارہ اتر اور بے چھت کو ٹھڑی کے در و دیوار نیلا ہٹ میں رنگے گئے..

”میں اندھیرے میں ہوں اور اس کے باوجود تمہاری جانب کھنچی چلی جاتی ہوں..

اب اس کی توجیہ کیا ہے؟“

اجرک کے کھلے کرتے اور شلوار میں اس کا بدن بے حد مختصر تھا.. ایک مٹھی میں آجانے والا بدن.. اس کی آنکھوں کے تلے اس کے ہونٹ تھے جو دکھائی نہیں دیتے تھے..

متلاشی روحوں کے سانسوں میں کچھ اور سانس شامل ہوئے.. کیونکہ ہونٹوں کی نمی دیکھنے سے نہیں محسوس کرنے سے ہوتی ہے..

ریٹنگ پر رکھے ہاتھ کا لمس جب سفر کرتے ہونٹوں تک پہنچتا ہے تو اس کی گرم نمی سے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور ایک مٹھی میں آجانے والا بدن بھی اپنے لمس سے باہر ہو جاتا ہے۔

سرکپ کے شہر قدیم اور خاموش.. ٹیکسلا میوزیم کی آبیوی میں ڈھکی تاریکی میں روپوش.. دھرمراجیکا سنوپا کی قربت میں سے گزرتے.. اور پھر یکدم جی ٹی روڈ کے نکل اور تیز فل لائٹس میں شامل ہونے تک ایک ٹھہری ہوئی خاموشی نے ان کی میزبانی کی.. اس کی مٹھی ابھی تک اس حدت میں تھی جو اُس میں آجانے والے بدن نے عنایت کی تھی..

”کل رات پیر سہاوا سے واپسی پر... اگر میں دائیں ہاتھ مڑنے کا انڈی کیٹر نہ دیتا اور سیدھا چلا جاتا تو کیا واقعی تم میرے ساتھ چلی جاتیں؟“

”پہل بھر کے لیے شعور کھودینے کا کوئی لمحہ تھا.. مجھے یاد نہیں۔“

”کیا تم سیرکس تھیں؟“

”میں وہاں تھی ہی نہیں.. بار بار اس کا تذکرہ مت کرو“ وہ ویسے ہی ٹھنڈی اور لا تعلق ہو گئی جیسے اپنے ہوٹل کے لوگ روم میں تھی.. ایک اجنبی وجود ”احتیاط سے ڈرائیو کرو.. سامنے سے آنے والی ہیوی ٹریفک کی فل لائٹس آنکھوں کو اندھا کر رہی ہیں۔“

سپر مارکیٹ کے ویران چوک میں آج بھی ”مسٹر بکس“ کے نیون سائن کی روشنیاں تار کول پر جلتی بجھتی اسے رتلمیں کرتی تھیں.. چوک سے بلیو ایریا کی جانب سنیئرنگ گھماتے ہوئے خاور نے پھر اس کی طرف دیکھا کہ شاید اس کے چہرے پر کوئی رنگ آئے لیکن وہ ایک ایسے اجنبی کی مانند لا تعلق بیٹھی تھی جس نے اس کی کار میں لفٹ لی تھی..

”دائیں ہاتھ پر ناظم الدین روڈ کا موڑ ہے..“

”ہاں ہاں میں اندھی نہیں ہوں.. ادھر ہی مڑنا ہے..“ اس نے ایک بیزار ناپسندیدگی سے کہا۔

وہ یکدم طیش میں آگیا.. ”میں تمہیں سمجھ نہیں سکا..“

”میں بھی موت کو اور زندگی کو سمجھ نہیں سکتی.. اگلے ماہ میں ڈاکٹر ہاشم سے شادی کر رہی ہوں.. وہ میرا کوئی لگ ہے.. اور ہم دونوں اکثر دور افتادہ دیہات میں ٹور کے لیے جاتے

رہتے ہیں.. پولیو کی ویکسین کے فوائد بتانے..
وہ مکمل بے اعتنائی اور اجنبیت سے دروازہ کھول کر اتر گئی..

پانیوں کے سفر نے سب کو تھکا دیا تھا..
سب سو چکے تھے..

البتہ ایک مسافر ابھی تک بیدار تھا.. اور آنکھیں نہ جھپکتا تھا.. خاور کی کمر پر اس کی گرم ہواؤں کی پھونک و قفوں و قفوں سے آ رہی تھی اور وہ اس کی موجودگی سے غافل نہیں ہو سکتا تھا..

پکھلی نہیں سوئی تھی..

وہ کسی ٹیلے پر بیٹھی اپنی سیاہ دروازے کی آنکھیں کھولے کوئی سیاہ سحر پھونکنے چلی جا رہی تھی..

طبع حرص سے کبھی آزاد نہیں ہوتی اگرچہ بدن حرص کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا..
خاور نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے پاس آنے کو کہا..

وہ اپنے بھاری کولہوں سے ریت جھاڑتی ہوئی اٹھی اور پاؤں تلے کی ریت میں سے قدم نکالتی آہستہ آہستہ نکالتی اس کے قریب آ بیٹھی..

”جی سائیں..“

”تمہارا بچہ کہاں ہے؟“

”کشتی میں پڑا سوتا ہے سائیں..“

”سرور اعتراض نہیں کرتا؟“

”نہ سائیں.. روزی روزگار کا معاملہ ہے.. آپ لوگ ہمارا کچھ لے کر تو نہیں جاتے کچھ دے کر جاتے ہو.. پر سائیں ایک عرض گزاروں؟“

”بولو..“

”بہت بے پرواہ ہو سائیں.. ہمارے توجہ وادھر کشتی میں آتا ہے تو پہلی رات ہی حکم لگا دیتا ہے.. ہم حکم کے بندے ہیں.. پر سائیں آپ بے پرواہ ہو بہت راتوں کے بعد خیال کیا.. اب حکم لگاؤ..“

اس کی کانٹھی بہت مضبوط تھی.. ایک دراوڑ پیٹھ ریت میں دھنستی اپنے کولہوں کی چوڑائی پر ٹھہرتی تھی.. اس کے میلے کپیلے جھکے میں سے اس کی چھاتیاں زور کرتی تھیں..
وہ سلطانہ کے بچے سے بالکل مخالف سمت میں تھی..

وہ ایک غیر جانبدار مبصر کی مانند بہت دیر تک اسے جانچتا رہا..

”حکم کریں سائیں.. ادھر ریت پر پاکشتی میں..“

”تم کشتی میں جا کر اپنے بچے کا خیال کرو پکھلی.. اس کے بغیر بھی تمہارے روزی روزگار کا بندوبست ہو جائے گا..“

خاور کو محسوس ہوا کہ جب پکھلی اٹھی ہے تو اس میں روزی روزگار سے اجتناب کی مایوسی نہ تھی بلکہ حیاتی کے کل تجربے کے برعکس جو رد عمل خاور کا تھا اس کی حیرانی تھی..

بارہ کپو کے گھر میں عابدہ سومرو کا جو فون اس رات آیا وہ آخری لگتا تھا..

اس کی آواز پہچانی نہیں جاتی تھی ’زخروے کی خرخراہٹ اور ڈوبتی ہوئی نبضوں جیسی ایک مرتی ہوئی کسی اور عورت کی آواز.. جس کے لفظ اٹکتے اور ڈوبتے تھے اور سمجھ میں نہیں آتے تھے..

”مجھے دکھائی نہیں دے رہا.. میری آنکھیں.. میں نے ٹول ٹول کر تمہارا نمبر ڈائل کیا ہے.. بہت.. بہت اندھیرا ہے.. جھوٹ بولا تھا ڈاکٹروں نے.. کہ میں.. میں نیند میں.. مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا.. میری رگیں کٹ رہی ہیں.. میں.. میں.. کچھ نظر نہیں آ رہا.. صرف سورج کا ایک سرخ گولا ہے.. تمہارے.. تمہارے چہرے سے پرے.. کھڑکی کی چوکھٹ پر انکا ہے.. میری زبان بھی بند.. بند ہونے کو ہے.. خاور.. سائیں.. گرم کرو.. تم آ نہیں سکتے.. کیا تم..“

فون بند ہوتے ہی اس نے اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا.. کل کسی بھی فلائٹ کے لئے.. کراچی کے لئے.. میری بکنگ کر دو..

کل تو نہیں.. کسی بھی فلائٹ پر کوئی نشست نہیں.. البتہ پرسوں..

لیکن کل..

چانس پر بھی نہیں ہے..

ٹھیک ہے.. پر سوں..

”شی از پلیٹنگ و دیو...“ اس کی غلافی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ”وہ تم سے کھیل رہی ہے..“

”عابدہ؟“

”نہیں نہیں.. یہ سلطانہ.. وہ اپنے بدن کے زور سے تم سے کھیل رہی ہے..“

”اس کا بدن تو ایک مٹھی میں آسکتا ہے.. جب کہ تم..“

”ڈونٹ بی سکی.. میں نے تو تین بچوں کو جنا ہے اور...“

”اس کے باوجود تمہارے بدن میں وہ زور ہے جس سے تم کھیل سکتی ہو.. تم اس کی نسبت کہیں زیادہ کشش کی حامل ہو..“

وہ ذرا شرمائی.. ”لیکن یہ جو کہانیاں وہ تمہیں سناتی ہے.. اپنے بارے میں یہ سب وہ گھڑتی ہے تمہیں چرنے کے لئے.. کسی کو بھی یہ کہانیاں سناؤ وہ تمہیں یہی کہے گا..“

”اگر میں تمہاری کہانی کسی کو بھی سناؤں تو بھی وہ یہی کہے گا کہ یہ من گھڑت ہے..“

”بہر حال تمہیں عابدہ کو دیکھنے جانا چاہئے.. ہر صورت میں.. کسی مرتے ہوئے شخص کو انکار نہیں کرنا چاہئے.. جو شخص یہ جانتا ہو کہ وہ مرنے والا ہے اس کی ناامیدی اور بے بسی سے تم کیسے واقف ہو سکتے ہو.. تمہیں جلد از جلد جانا چاہئے.. کہیں دیر نہ ہو جائے.. لیکن اس سے بچو اس نیلی آنکھوں والی نوجوان چڑیل سے جس کے امر کی لہجے سے تم متاثر ہو گئے ہو..“

نیلی آنکھوں والی چڑیل اس شب کی مغائرت اور اجنبیت بھلا چکی تھی جب اس کا فون آیا.. اسے امید بھی تھی اور وسوسے بھی تھے.. عابدہ کی مرگ بے بسی میں ڈوبی ہوئی آواز نے سلطانہ کو ذرا پیچھے دھکیل دیا تھا.. اگر وہ اس کی تشویش اور کراچی جانے میں نہ الجھا ہوتا تو وہ اب تک ایک مرتبہ پھر اس سخت گیر وارڈن کے سامنے کھڑا ہوتا.. بے شک پھر بے عزت اور بے توقیر ہوتا لیکن اس کی بے رخی کے باوجود وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا..

اور پھر فون آگیا.. جس میں اپنائیت کا رچاؤ تھا..

”کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہے؟“

”آل دے ٹائم ان دے ورلڈ...“

اس کی آواز سنتے ہوئے ایک بچگانہ مسرت سے دو چار ہوتا تھا.. اسے بہت وسوسے تھے کہ وہ دوبارہ فون نہیں کرے گی..

”کیا ہم مل سکتے ہیں؟“

”ہاں.. لیکن..“

”میرا رویہ ایسا تھا کہ تم شکایت کر سکتے ہو.. لیکن میں بس ایسی ہی ہوں.. اور تم سے ملنا چاہتی ہوں..“

”مجھے آج سہ پہر کراچی جانا ہے..“

اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ نہیں.. عابدہ سومرو کے لئے وہ اب کچھ نہیں کر سکتا.. سلطانہ کو دیکھنے کی ہوس اتنی شدید تھی کہ وہ ہر اخلاقی قدر کو پامال کر سکتا تھا..

”بہت ضروری ہے؟“

”ہاں.. زندگی اور موت کا مسئلہ ہے.. لیکن..“

”آج سہ پہر؟.. کیا یہ ممکن ہے کہ تم.. آپ.. ابھی کچھ دیر کے لئے اسلام آباد آجائیں..“

وہ ”تم“ اور ”آپ“ کے درمیان بھٹکتی رہتی تھی..

اس کی کیا توجیہ ہے کہ ایک عورت گفتگو کے دوران ”آپ“ سے مخاطب ہوتی ہے پھر یکدم ”تم“ کہتی ہے اور پھر سے ”آپ“ کی جانب لوٹ آتی ہے.. یہ کچھ لہریں تھیں اس کے اندر جو کنارے کی آخری حدوں تک پہنچ کر اس کی قربت سے چھوٹی تھیں تو وہ ”تم“ ہو جاتا تھا اور جب وہی لہریں سمت کر دور ہونے لگتی تھیں تو پھر ”آپ“ آ جاتا تھا..

”ہاں.. ڈاکٹر ہاشم اگر معترض نہ ہوں تو...“

وہ اس شب کے بعد جب اسے یکدم ڈاکٹر ہاشم کے ہونے کی اطلاع دی گئی تھی وہ اس انجانے ڈاکٹر کے لئے بغض اور کینہ پال رہا تھا.. وہ جو بھی تھا.. اس کی نسبت کہیں زیادہ کم

عمر.. پینڈ سم اور مردانگی کی قوت سے بھرا ہوا تھا.. اور سلطانہ کا حقدار تھا.. لیکن خاور کے اندر بھی جو دوسرا وجود تھا وہ اس ڈاکٹر ہاشم کے ہم پلہ.. اتنا ہی کم عمر، پینڈ سم اور مردانگی کی قوت سے بھرپور تھا.. بے شک حقائق اس کے برعکس تھے.. لیکن ان دنوں.. ایک نسوانی تثلیث کی زد میں.. قربت مرگ میں.. تمام حقائق جھٹلائے جا رہے تھے..

فون پر اس کی آنکھوں کی مدھم مدھم ہنسی اس کے کانوں تک آئی جو کہتی تھی.. ”یو سلی اولڈ مین“

غار کی انتہا تاریکی اور گہرائی میں سے... اس میں مقیم چمگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ اور ان کی چپیں چپیں کرتی آوازیں ایک ہلکی گونج کے ساتھ باہر آتی تھیں اور ان کے ہمراہ ایک سرد ہوا سفر کرتی آتی تھی جو ان دونوں کی پشتوں سے نکلنے کی ریزہ کی ہڈیوں کو ٹھنڈا کرتی اس بلندی سے نیچے اتر جاتی تھی۔

پہلی دھوپ کے سنہرے پن میں آئی ہوئی لمبی جنگلی گھاس بھی سنہری ہوتی تھی اور پہاڑیوں پر جہاں جہاں چھاؤں تھی وہاں ڈھلوانوں پر وہی گھاس گہرے سبز رنگ میں ڈھلتی سرسراتی تھی.. نامعلوم سی ہوا کی موج کی زد میں آکر وہ دوہری ہوتی تھی.. چھاؤں بے آواز ریگیتی ہوئی دھوپ کی روشن اور زرد ملکیت میں داخل ہوتی تو سنہری گھاس سائے میں آکر سیاہی مائل ہو جاتی.. اور بہت نیچے.. بھوری، سنہری اور سیاہی مائل گھاس کی ڈھلوانوں سے کہیں نیچے فہرا مراد کی خانقاہ کے کھنڈروں پر پوش تھے.. اور ان کی روپوشی سے پرے.. خان پور جانے والی سڑک درختوں کی ایک سبز غار کے اندر تھی اور اس کے آگے مالٹوں کے باغ تھے.. ہریا دل کا ایک طویل میدان تھا جس میں کہیں کہیں گھر اور گاؤں تھے اور ان کے آخر میں سردیوں کی ہلکی دھند میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا.. تاحہ نظر وہی منظر تھا جو جولیاں کے کھنڈروں سے نظر کے سامنے آتا تھا اس لئے کہ یہ دونوں بدھ خانقاہیں متوازی پہاڑیوں میں واقع تھیں.. جولیاں پہاڑی کی چوٹی پر تھی اور فہرا مراد پہاڑیوں کے دامن میں چھپی ہوئی تھی۔

صرف چمگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ کانوں میں آتی تھی یا ہوا تھی.. جو گھاس پر سرسراتی چلتی تھی تو وہ دوہری ہوتی تھی.. یا پھر اس بلند مقام پر... غار کے دہانے پر ایک

سنائے اور تنہائی کی موجودگی تھی جو سنائی دیتی تھی.. اور کبھی ایک طویل وقفے کے بعد کسی ڈھلوان کی گھاس میں نظر نہ آتے کسی ڈھور ڈنگر کے گلے میں بندھی گھنٹی کا ارتعاش.. ٹنن ٹنن.. سندھ کے کناروں پر اترنے والے موسیقیوں کے ترنم آویز گھنٹیوں کے بلاوے کی طرح.. ڈھلوانوں پر سفر کرتے ان کے کانوں میں آتا اور پھر ان کی گونج مٹنے ہی پھر سے سنائے کی حکمرانی ہو جاتی..

وہ ایسی بلندی پر تھے کہ فیکسلا سے خان پور جاتی ہوئی سڑک پر... درختوں کی سبز غار میں چھپی ہوئی سڑک پر ٹریفک کا جو شور تھا وہ ان تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ جاتا تھا۔

اور وہ اس کی زد سے باہر.. چمگادڑوں کی سیاہ کلبلاہٹ سے بھری انتہا تاریکی میں اتری ہوئی غار کے دہانے پر بیٹھے.. کنکروں اور سخت گھاس پر براجمان آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھے تھے اور سامنے پھیلے منظر کو نکتے تھے.. ان بدھ بھکشوؤں کی طرح جنہیں یہی تاشیلا.. یہی مقامات اور یہی وادی امن آشتی اور نروان عطا کرتی تھی.. اسی لئے انہوں نے اس کی ڈھلوانوں پر اپنی مقدس ترین خانقاہیں، عبادت گاہیں اور درس گاہیں تعمیر کیں.. انہیں بھی یہی وہم تھا کہ اُن کا عقیدہ بھی تا ابد ہے.. یہ خانقاہیں اور سنیو پاز ہمیشہ قائم رہیں گے.. اور اُن کی جگہ کوئی اور نیا عقیدہ، نیا معبد نہیں آئے گا.. ہر نسل اسی وہم کا شکار ہوتی ہے.. اس کی اسیر ہوتی ہے اور اس زمین کو صرف اپنے مذہب اور روایت کی قیدی سمجھتی ہے.. جب کہ زمین پابند نہیں ہوتی.. وقت اور زمانے کے تغیر اس پر رونما ہونے والے عقیدے اور عبادت گاہیں بدلتے رہتے ہیں.. ان عبادت گزاروں کو یہاں سے رخصت ہوئے ہزاروں برس گزر چکے تھے.. اور جو آج کے عبادت گزار تھے انہیں بھی کبھی.. یہاں سے رخصت ہوئے ہزاروں برس گزر جائیں گے.. لیکن لمحہ موجود میں وہ ابھی ایک وہم میں ہیں۔

ایک پڑ پھیلاتی چمگادڑ غار کے اندر سے نمودار ہوئی اور ایک بڑی سیاہ چٹنگ کی مانند ان کے سروں پر سے ڈولتی ہوئی گزر گئی.. سلطانہ خوفزدہ ہو کر جھکی کہ اس نے چمگادڑ کی پھڑ پھڑاہٹ کو اپنے باب کٹ بالوں پر محسوس کیا تھا..

”تم ہمیشہ مجھے عجیب و غریب وہم انگیز جگہوں پر لے آتے ہو“

”یہ ان چمگادڑوں کی طرح میری آماجگاہیں ہیں.. میرے خفیہ ٹھکانے ہیں..“

”اور آپ ایک خاص منصوبے کے تحت اپنی فرینڈز کو ان خفیہ ٹھکانوں پر لاتے“

ہیں اور وہ ان کے سیاہ سحر میں مبتلا ہو کر آپ کے قریب ہو جاتی ہیں؟“
 ”نہیں... تم پہلی عورت ہو جس کے ساتھ میں یہاں آیا ہوں۔“
 ”آپ مجھے ساتھ لے کر آئے ہیں... میں آپ کے ساتھ نہیں آئی۔“
 ”درست...“

”اس روز ہم جولیاں کے کھنڈروں میں گئے تھے... یہیں کہیں... اور آج... تمہیں اس علاقے سے کوئی خاص رغبت ہے؟“
 ”پہلے تو نہیں تھی... پھر غروب کی کرنوں کی نزدیکی میں اور تنہائی میں چونکہ انسان خود کھنڈر ہو رہا ہوتا ہے... عناصر میں مل جانے کا وقت قریب آنے لگتا ہے تو اسے کھنڈر ہی اچھے لگتے ہیں۔“

”اور چگاڈریں...“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں چگاڈریں اور چڑیلیں بھی...“ خاور کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔
 اسے احساس ہوا کہ منظر کا پھیلاؤ، بلندی اور گھاس کی سرسراہٹ اور تنہائی اس پر غالب آگئی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ سلطانہ کے وجود سے غافل ہو گیا تھا۔

سرد دن کی دھوپ میں... خاور نے اسے دیکھا تو جیسے پہلی بار اسے نگلی آنکھ سے دیکھ رہا تھا... کلوڑاپ میں اس کے چہرے کو ایک بڑی سکرین پر دیکھ رہا تھا... کانوں کو روپوش کرتے کندھوں سے ذرا اوپر جھولتے نیم سنہری بال جن میں کہیں کہیں سفیدی کی لکیریں تھیں اور بھلی لگتی تھیں، ان کے نیچے رخساروں پر روئیں تھے جو دھوپ میں الگ الگ اور سنہری ہوتے تھے... جیسے سونے کی کومل کو ٹیلیں مساموں میں سے پھوٹ رہی ہوں اور وہ ہوا کے ہر جھونکے سے نہایت خفیف سے حرکت کرتے تھے... گہرے براؤن رنگ کی لپ سنک کے نیچے ہونٹوں کے جو مسام تھے وہ بھی زندہ اور بولتے تھے... جدا جدا دکھائی دیتے تھے اور آنکھوں میں جو کانچ ایسی نیلاہٹ تھی وہ سیال لگتی تھی... جیسے ابھی بننے لگے گی اور اس کے رخساروں پر نیلی دھاریاں بناتی گردن کے راستے اس کے سینے پر پھیل کر اسے بھی نیلا کر دے گی۔ وہ اسے ایسے نظر آ رہی تھی جیسے وہ ایک مائیکروسکوپ پر جھک کر اسے دیکھ رہا ہو... ہر مسام اور ہر روئیں کی تفصیل واضح اور دلکش تھی۔

اس پر سے نظریں ہٹا کر خاور نے نیچے پھیلے ہوئے منظر کو دیکھا تو بھی اس کا چہرہ

ساتھ چلا آیا اور اور منظر کے سامنے حائل ہو گیا... وہ آنکھیں جھپکے بغیر ایک فائز افضل شخص کی مانند ہو رہا تھا جو شیشے کے گزے کی تیز دھار سے اپنی کلاںیاں چھیلتا رہتا ہے، گردن پر اس شیشے کو ایک آری کی طرح چلاتا ہے اس میں سے خون نکالتا ہے اور اسے کوئی اذیت نہیں ہوتی، درد نہیں ہوتا صرف خون نکلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے کہ یہ کہاں سے آگیا... وہ ایسی ایک بے حس محویت سے اپنی آنکھوں اور منظر کے درمیان حائل چہرے کو تکتا جا رہا تھا... یہ چہرہ کہاں سے آگیا... اس کے روئیں اور مسام چومنے کی چاہت اس میں سرکشی کرتی تھی۔

”ہیلو...“

سلطانہ کی انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آئیں۔

”کیا تم ابھی تک یہاں ہو؟... کہاں ہو؟“

”تم وہاں بھی ہو“ اس نے ہاتھ سے ڈھلوان کے پار کی وسعت کی طرف اشارہ کیا اور پھر منہ موڑ کر اسے دیکھا۔ ”اور یہاں بھی... میں کہیں نہیں ہوں۔“

ایک مقامی چرواہا اپنے مویشیوں کو ہانکتا بلند گھاس میں سے نمودار ہوا۔

اس نے سر اٹھا کر انہیں غار کے دہانے پر براہمان دیکھا اور شک سے دیکھا کہ یہ شہر کے لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں... پھر شاید اس نے ان کی عمروں کے تفاوت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر سر جھکا لیا اور اپنے مویشی ہانکتا نیچے چلا گیا۔

وہ ایک طویل مدت کے بعد یہاں آیا تھا۔

مہرہ مرادو کی خانقاہ سے بلند ایک ڈھلوان کی اوٹ میں پوشیدہ یہ غار اور اس کا دہانہ داؤد کی دریافت تھی... وہ ہمیشہ انجانے، مجید بھرے اور الگ ٹھکانے تلاش کرتا اور اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا لے جاتا کہ وہ بہت چست، ایک بھیڑیے کی مانند صحت مند اور غراتا ہوا پھر تپتا تھا... یہ ایسے ٹھکانے ہوتے جن کی خبر بہت کم لوگوں کو ہوتی... نور پور کے اوپر برازیل کے بارشوں والے جنگلوں ایسی ایک خفیہ آبشار... پیر سوہادہ سے کہیں آگے وہ ویران ریست ہاؤس جہاں راتوں کو معدوم ہو جانے والی نسلوں کے آخری پرندے بولتے تھے... اور نگ زیب کے زمانے کا ایک کنواں اور اسی عہد کی چرخوی... سون ندی کے کنارے وہ ذخیرہ جو سانپوں سے انا پڑا تھا اور سپیروں کی مرغوب شکار گاہ تھی... اس کے برابر میں ہائی وے کا وہ حصہ جہاں سردیوں کی بخ راتوں میں ٹھہرتے ہوئے سانپ ریگتے ہوئے آتے تھے تاکہ

سے کھکشاؤں اور اجنبی دنیاؤں اور بلیک ہول گزرتے جاتے تھے مگر وہ تنہا تھے۔
”تم کبھی اس غار کے اندر بھی گئے ہو؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”ہاں یار۔“ وہ ایک لگژری کی طرح بے پناہ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی سے بہت دور چرتے مویشی بھی تھو تھنیاں اٹھا کر دیکھنے لگے کہ یہ ہولناک آواز کہاں سے آئی ہے اور ہر اسان ہو گئے۔ سرسراہٹ ہوئی گھاس بھی لمحہ بھر کے لئے ساکت اور دم بخود ہو گئی۔ ”ہاں یار۔“ میں نے تحقیق کی ہے۔ ادھر کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ غار اندر ہی اندر مرگہ کی پہاڑیوں تک جاتا ہے اور ہزاروں سال پہلے گوتم کے جو چیلے ہوتے تھے وہ مشعلیں جلا کر اس کی تاریکی کے اندر اترتے تھے اور پھر سفر کرتے ہوئے کسی مقام پر ٹھہر جاتے تھے اور گیان دھیان میں گم ہو جاتے تھے۔ میں ایک بار اس غار کے اندر بہت دور تک گیا تھا کہ شاید وہ بھکشو ابھی تک گیان دھیان میں فنا ہوں اور انہیں علم ہی نہ ہو کہ باہر ہزاروں برس بیت چکے ہیں اور میں ان میں سے کسی ایک بدھ بھکشو سے پوچھوں کہ بابا لوگ ہمیں تو سمجھ نہیں آئی۔ ہم تو نکریں مار مار کر ہلاک ہو گئے ہیں لیکن کچھ پتا نہیں چلا تو۔ تم ہی بتا دو کہ اس زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ نہ ملیں تو ان کے ڈھانچوں سے ہی پوچھ لوں۔ لیکن خاور جو نبی میں غار کے اندر داخل ہوا اور باہر سے آنے والی روشنی مدھم ہو کر یکدم گھپ اندھیرے میں بدلی ہے تو میں گھبرا گیا۔ چکاڈڑوں کے بصرے اور ان کی پھڑپھڑاہٹ سے نہیں۔ بلکہ موت ایسے اندھیرے سے۔۔۔ یار موت سے بڑا ڈر لگتا ہے۔“

شام ہوئی تو بابا طفیل بخش ہانپتا ہوا ایک کچی ہانڈی اور دسترخوان میں بندھی روٹیاں اٹھائے اوپر آتا دکھائی دیا۔ وہ دونوں کھانے کے بعد نیم تاریکی میں بھٹکتے نیچے آئے اور دنیا کے پر شور عذاب میں داخل ہو گئے۔
خاور ایک طویل مدت کے بعد یہاں آیا تھا۔

یہاں پہنچنے پر اس نے غار کے سامنے جو جھاڑیاں اور پتھر تھے انہیں جھک کر غور سے دیکھا تھا۔ داؤد کے آثار تھے۔ وہاں ابھی تک اگرچہ چپکے ہوئے اور بارشوں سے بوسیدہ وہ دونوں پیپر کپ موجود تھے۔ وہ جو داؤد کا تھا اور نہ ہا ہو کر گھاس میں اٹکا ہوا تھا۔ اور اس پیپر کپ کے کناروں سے اٹھتے ہوئے وہ اس کی ہنسی اور لا پرواہ پوری زندگی کو سن سکتا تھا۔
پچھلے برس اس بھیڑیا بدن اور پھڑکتے ہوئے شخص کا دل بے وجہ بے جواز رک گیا

تار کول میں جذب دن کی دھوپ کی ہلکی حدت جو رات ہونے پر اس میں موجود ہوتی تھی، اس پر لوٹ سکیں اور پھر ٹریک سے کچلے جاتے تھے۔ اور پھر یہ غار۔ اس کے الگ ہی ٹھکانے تھے۔

پہلی بار وہ اسے زبردستی یہاں لایا تھا۔

خانپور جانے والی روڈ سے الگ ہو کر ناہموار اچھلتے کودتے کچے اور سنگدل راستے پر کار ڈال کر۔ کسی غیر ملکی کے تعمیر کردہ گنبد نما گھر کے پھاٹک سے گزرتے۔ اور اس کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے اور اس کی تہہ خانے میں مذہبی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جسے وہ پڑھتا رہتا ہے اور شاید ہی اپنے گھر سے باہر آتا ہے یا کسی سے میل ملاپ کرتا ہے۔ وہ ایک ندی کی قربت میں پہنچے تھے جہاں داؤد نے کار پارک کر دی تھی۔ مہرہ مراد کی عبادت گاہ کے کھنڈروں کا رکھوالا بابا طفیل بخش اس کا پرانا بیلی تھا۔ داؤد کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ وہ پہلی ملاقات پر ہی دوسرے شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتا تھا، پرانا بیلی بنا لیتا تھا۔ بابا طفیل بخش نے انہیں پہلے تو ان آثار کے بارے میں ایک راہنما لیکچر دیا۔ کچھ شکستہ مجستے اور ستون دکھائے۔ خانقاہ کی کوٹھڑیاں دکھائیں اور پھر ان کھنڈروں کے اوپر اس کی رہائش میں جو کچی کوٹھڑی تھی اس کی چوکھٹ کے برابر میں اینٹوں پر رکھے گھرے میں سے پانی پلایا جو خنک اور شیریں تھا اور پھر کہا ”صاحب آپ تو غار پر جانے کے لئے آتے ہو۔ تم چلو۔۔ میں کھانا بنا کر لے آؤں گا۔“

کھنڈروں سے غار تک کی چڑھائی جان لیوا تھی۔ لیکن داؤد ایک بکری کی پھرتی اور ایک بھیڑیے کی صحت مندی کے ساتھ جستیں بھرتا آگے آگے چلا جا رہا تھا اور خاور ہر دوسرے پتھر کو تھام کر۔ اگرچہ یہ برسوں پہلے کا قصہ تھا۔ تب بھی وہ اپنے سانس کو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے کے خوف سے اسے بچانے کے لئے ہونکتا ہوا کھڑا ہوتا تھا۔
غار تک پہنچ کر وہ اس کے دہانے کے آگے بیٹھ گئے اور سامنے کے منظر کی سرکشی نے ان کی آنکھوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور وہ صرف ان کے لئے ہو گیا۔
داؤد نے پیپر کپس میں اپنے لئے اور اس کے لئے کچھ پینے کے لئے انڈیلا اور وہ باتیں کرنے لگے۔

یہ کوئی اور سیارہ کوئی اور کائنات تھی جس میں وہ تنہا سفر کرنے لگے۔ آس پاس

تھا اور اس پر جھکنے والے دوست نے دیکھا کہ جتنی دیر میں وہ تشویش سے ابھی مسکراتے اور سگریٹ کا آخری کش لگاتے داؤد کے چہرے تک گیا ہے تو اتنی دیر میں اس کی زندہ آنکھیں مردہ ہو گئیں۔

اسی لئے وہ اتنی مدت کے بعد یہاں آیا تھا۔
”تم کہیں تو ہو۔“

سلطانہ کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ اس کی اتنی طویل خاموشی اسے خدشات میں مبتلا کر رہی تھی۔

”میں یہیں ہوں۔“ اس نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ ”شاید میں عمر رفتہ کی غنودگی میں تھا۔ تم جانتی ہو کہ عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں غنودگی اور مستی در آتی ہے۔“
ایک اور سیاہ پتنگ چگاڑو جھولتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزر کر ایک نیم دائرے میں ڈولتی غار میں واپس چلی گئی۔
”تم چگاڑوں سے ملنا پسند کرو گی؟“

”نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا اور اس کے بال دیر تک اس کی گردن پر ایک ایک کر کے گرتے رہے۔ ”تم ایک عجیب خصلت کے شخص ہو لیکن۔۔۔ ہاں۔۔۔ اگر تم میرا ہاتھ تھام لو تو۔۔۔“
غار کے اندر پتھروں کے انبار اور سیلاب تھی۔ باہر جتنی بھی روشنی باقی تھی وہ بہت دور تک نہیں اترتی تھی مدھم ہو کر یکدم بجھ جاتی تھی اور آگے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ آگے ایک سرد اندھیرا منہ کھولے ہوئے تھا۔ ایک آہستگی ہوا کی تھی جو ان کے چہروں کو چھوٹی ہوئی نکلتی تھی۔ اور لا تعداد چگاڑوں کی جیس جیس اور پروں کی سیاہ پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ نارنج کی روشنی بھی چند قدم جا کر دم توڑ دیتی تھی۔

اس کا بدن ایسا تھا کہ مٹھی میں آسکتا تھا اور وہ اس کی مٹھی میں دھڑکتا تھا۔ وہ اسے سہارا نہیں دے رہا تھا بلکہ وہ تھی جو اسے آسرا دے رہی تھی۔

پہلی بار وہ اس غار کے اندر اترتا تھا اور اس کے اندر بچپن کے سب بھوت پریت قہقہے لگاتے ہوئے پھر سے جنم لیتے تھے۔ وہ خوفزدہ تھا لیکن اپنے خوف کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

نارنج کی روشنی پتھروں میں پوشیدہ ایک آبی ذخیرے پر پڑی اور وہ رک گئے۔ ایک تالاب سا تھا جس میں غار کی چھت میں سے برستے پانی ٹپ ٹپ گرتے تھے۔ اور نارنج کی روشنی

میں تالاب کے پانی اتنے شفاف تھے کہ اس کی تہہ برہنہ لگتی تھی اور عجیب ہیئت اور رنگوں کے کیڑے مکوڑے اس میں تیرتے تھے۔ ان میں ایک چھوٹی سی سفید دودھیا سفید رنگت کی مچھلی تھی جس کی آنکھیں نہ تھیں اور وہ بے چینی سے اپنی نابینائی میں ادھر ادھر تیرتی تھی اور آس پاس جو کیڑے مکوڑے تھے ان کی۔۔۔ نارنج کی لائٹ میں چند حیا دینے والی سرا سیمگی کو محسوس کرتی تھی۔

”کیا یہی مرگ ہے؟“ اس کے بازو میں پیوست سلطانہ چمٹی ہوئی۔ ایک جان ہو کر۔ اس کے مٹھی بھر بدن کی اور آنکھوں کی نیلاہٹ تھر تھراتی ہوئی اس سے پوچھتی تھی۔
”میں نہیں جانتا۔“

”میں تم سے مرگ کا مجید پوچھنے آئی تھی۔ کیا یہی مرگ ہے؟ گھپ اندھیرا۔ اور ایک تالاب میں تیرتی تہا اندھی مچھلی۔“
”میں نہیں جانتا۔“

تالاب کی شفاف سطح پر مرکوز روشنی کے دائرے کو اٹھا کر اس نے سلطانہ کے چہرے کی جانب کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ دیکھ نہ سکتی ہو۔ ”یہ میں ہوں۔۔۔ آج میں نے اپنے آپ کو دیکھ لیا ہے۔“ وہ بہت دیر ج میں تھی۔ اطمینان میں تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ ”میں اسی طور نابینائی میں تیر رہی تھی۔ اپنے تئیں سب کچھ دیکھتی تھی۔ اپنے قبیلے کو تیاگ کر دوسرے قبیلے کے رسم و رواج اپناتی تھی اور ویسے تو ہر کوئی ہنس سکتا تھا اور قہقہے لگا سکتا تھا۔ جیسے میں لگاتی تھی۔“ اس نے یکدم آنکھیں کھول دیں اور ان کے مقابل نارنج کی گولائی کو روشن پایا تو حیران ہو گئی۔ ”پلیز نارنج کو پرے کر دو۔۔۔ واپس چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

غار کے دہانے سے باہر آتے ہی پہلے سانس نے ان کو اطمینان دیا کہ وہ زندہ ہیں۔ غار کے گھپ اندھیروں کی مرگ سے بچ کر نکل آئے ہیں۔ گھاس میں الکا ہوا بارشوں سے بوسیدہ اور پچکا ہوا پیر کپ اگرچہ زندگی کی بے اعتباری کا شکوہ کرتا تھا۔

بابا طفیل بخش اپنی ہانڈی اٹھائے دسترخوان سنبھالے اوپر آ رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے نابیناؤں کی طرح بھٹکتے۔ ٹھوکریں کھاتے نیچے کھنڈروں تک آئے کہ شام کے بعد رات کی تاریکی یکدم اٹھ کر آئی

اور ہر سو چھا گئی۔ مہرہ مراد کی خانقاہ بھی ہزاروں برسوں کی ایک اور رات میں پنہاں تھی اور صرف بابا طفیل بخش کی لائین تھی جو اس کے شکستہ مجسموں.. دیواروں، کونڈھڑیوں اور خشک تالاب کو اندھیرے میں سے پل بھر کے لئے باہر لاتی تھی.. اور اس تالاب میں سفید رنگت کی کوئی اندھی مچھلی نہ تیرتی تھی..

”سنو پائی زیارت تو کریں گے ناں صاحب جی؟“

”ہاں...“

خانقاہ کے ایک کونے میں ٹین کا ایک سستا اور کھڑکھڑاتا دروازہ تھا جو مقفل تھا.. بابا طفیل بخش نے کمرے کی لمبی جیب میں پورا ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکال کر اس قفل میں متعدد بار گھمائی اور دروازہ کھل گیا۔

”آؤ صاحب جی..“

ایک مختصر اور ناکافی کمرے کے اندر شاید دنیا بھر میں ابھی تک موجود.. ہزاروں برس کی شکست و ریخت کو سہنے کے باوجود ابھی تک مکمل حالت میں محفوظ چونے سے تخلیق کردہ ایک سات منزلہ سنو پائی ناکافی کمرے کی قید میں تھا.. وہ ایک ایسے سرد کی مانند اونچا ہوتا تھا جسے قید تنہائی میں ایک عرصہ ہو چکا ہو.. اس کی ساتوں منزلوں پر ابھرتے بدھ کی حیات کے ادوار.. بنیاد کو کندھوں پر سہارتے دیوتا.. مینڈک اور ہاتھی ابھی تک اپنی قدیم حالت میں.. موجود تھے..

سنو پائی اور کمرے کی دیواروں کے درمیان بس اتنی سی جگہ تھی کہ اس میں سے کندھوں کو ذرا ترچھا کر کے ہی گزرا جاسکتا تھا..

لائین کی روشنی صرف دو منزلوں تک جاتی تھی اور ان سے اوپر سات آسمانوں کی علامت منزلیں کمرے کی چھت کی نزدیکی میں اندھیرے میں گم تھیں..

بابا طفیل بخش لائین اپنے چہرے کے برابر کئے سنو پے کی گولائی کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا، ہر نشان، ہر ابھار اور دل کشی کو روشن کرتا اس کے گرد پھیرے لگانے لگا.. اور وہ دونوں پجاریوں کی مانند اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے.. گوتم کی حیات ہر پھیرے کے خاتمے پر اگلی منزل پر اٹھ جاتی.. ملکہ مایا تالاب کے کنارے بدھ کی پیدائش کے منظر سے آغاز ہوتا تھا اور اس کی موت کے بعد اس کی راکھ کو مختلف پیالوں میں محفوظ کر کے اونٹوں

اور ہاتھیوں پر لاد کر ملک بھر کی ریاستوں کو روانہ کئے جانے کے منظر تک... ہر منزل کا پھیرا مکمل ہونے پر بابا طفیل بخش لائین کو اور اونچا کر کے اگلی منزل کو روشن کرتے چلے لگتا..

”بابا...“

”جی صاحب..“ وہ ایک تجربہ کار اور احتیاط پسند شخص تھا اس لئے ان پر نظر نہیں ڈالتا تھا، صرف لائین کی روشنی کی زد میں آنے والے چوٹے کی مجسموں کی طرف دیکھتا تھا۔

”آپ یہ لائین رکھ دیں... ہم ابھی آجائیں گے۔“

”جی صاحب..“ ان کی جانب نگاہ کئے بغیر اس نے لائین زمین پر رکھی اور ٹین کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر کے باہر چلا گیا۔

چونے کے گھیرے دار سات آسمان اس مختصر کمرے میں صرف ایک لائین کی روشنی میں ایک ایک کر کے اوپر ہوتے تاریکی میں جا رہے تھے..

”ہاں.. تمہیں عجیب و ہم انگیز جگہوں پر آنے کا خیال تھا..“ وہ ایک کونے میں سٹ کر بیٹھ گئی.. جیسے ایک امریکی لڑکی ہی بے تکلفی سے بیٹھ سکتی ہے.. دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں پر سر رکھے.. ”کوئی اپنی ڈیٹ کو ایسے انہوئے مقام پر بھی لا سکتا ہے، میرے گمان میں بھی نہ تھا.. اور یہ مقام مجھ پر اثر کرتا ہے.. میں نے بہت سے قبیلے بدلے ہیں اور اگر میں زیادہ دیر یہاں رہی تو مجھے پھر سے اپنا قبیلہ بدلنا ہوگا.. انسان اپنے عقیدے اور اس کی عبادت گاہوں کے ماحول میں ہی رہے تو محفوظ رہتا ہے.. ذرا اس سے باہر نکلے تو شک جزیں پھیلانے لگتا ہے کہ کیا پتہ یہ سچ ہو..“

لائین میں تیل کم ہو رہا تھا.. جتنی پھڑپھڑاتی اور یکدم جل اٹھتی.. وہ اس کے برابر میں جا بیٹھا۔

مہاتما بدھ... کنول آسن میں.. گیا کے جنگلوں میں.. اگلی ٹانگوں پر جھکے اپنے گھوڑے کتھکا سے رخصت ہوتے ہوئے.. مست ہاتھی کو رام کرتے.. اندر سالارا غار میں بلاؤں اور آفتوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے.. ایک بھاری پالیوں کے پٹنگ پر مردہ حالت میں اور سنبھے بھکشو بن کرتے.. اور ان کی چتا کے شعلے... سب کے سب لائین کی پھڑپھڑاتی روشنی میں.. اندھیرے میں او جھل ہوتے اور یکدم روشن ہوتے.. زندہ ہوتے.. حرکت میں آ جاتے..

”کیا پتا بھی سچ ہو... لیکن اس کے سوا ایک سچ ہے... جس کا مجھے پتا ہے... اور میں کہنا چاہتی ہوں۔“ سلطانہ کے ہاتھ نے اس کے جھریوں بھرے ہاتھ کو تلاش کیا اور اپنے لمس سے اسے رام کیا۔ ”تم نے کل صبح کراچی جانا ہے... اور مجھے بھی کل شام اپنی کینڈین این جی او کی جانب سے ایک ماہ کے لئے سری لنکا کے لئے روانہ ہونا ہے... ایک انٹرنیشنل ریسرچ پروجیکٹ ہے اس میں شریک ہونے کے لئے... اسی لئے میں آپ سے آج ہی ملنا چاہتی تھی...“

”آئی ہو پو پو دل انجائے یور سیلف...“

”پلیز مجھے درمیان میں مت ٹوکو ورنہ میں... میں بھٹک جاؤں گی، کہہ نہ سکوں گی... اگر میں نے اس رات تمہیں یہ کہا تھا کہ اگر تم دائیں ہاتھ پر ناظم الدین روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھے چلے جاؤ تو میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی... تو یہ سچ تھا... اس ایک لمحے میں جو میری سوچ اور بدن سے ماورا کہیں سے یکدم اتر اٹھا، میں اتنی ہی سنجیدہ تھی جتنی کہ میں اپنے باپ کی بیٹی ہوں... اگرچہ کار سے اترتے ہی میں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی تھی... تشویش اور شرمندگی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا تھا لیکن... اس لمحے کا سچ وہی تھا...“

”مجھے شبہ ہوا تھا کہ تم کوئی منصوبہ ساز بری عورت ہو...“

”کوئی بھی مرد یہی سوچے گا... اسی لئے میں شرمندہ تھی... اظہار کے سینکڑوں اور طریقے ہیں... لیکن اسی صورت میں جب سوچ سمجھ کر اپنی کیفیت کا بیان ہو... میں نے وہ نہیں سوچا تھا جو میں نے تم سے کہا... وہ لمحہ مجھ پر ایک ناگہانی آفت کی مانند ٹوٹ پڑا تھا... اور وہی سچ تھا...“

سلطانہ سمٹی ہوئی اس کے ساتھ آگئی... اس کے اندر سمٹی گئی...

سنو پا کے اس حصے پر جہاں مہاتما کو گیان حاصل ہوا تھا، روشنی یکدم بڑھ گئی۔

”تم مجھے کبھی اپنے گھر لے کر نہیں گئے... جہاں تم رہتے ہو... سوتے ہو... جاگتے ہو... دانشوں کو برش کرتے ہو... صبح کا پہلا سگریٹ پیتے ہو... وہ تحریریں لکھتے ہو جن میں مرگ ہوتی ہے جو مجھے تمہارے پاس لے آئی ہے...“

”وہاں... کچھ بھی نہیں ہے...“

”کیا میں وہاں ہو سکتی ہوں؟“

پھر پھڑپھڑاتی اور بجھنے والی لائٹیں کی روشنائی میں بھی اس کے گالوں کے رونے اور ہونٹوں کے مسام ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے تیز دھوپ میں ہوں۔

”سری لنکا سے واپسی پر...“ وہ ہاتھ بڑھا کر چونے کے اس مجھے پر انگلیاں پھیرنے لگی جو بدھ کے نروان کی شانتی کی شعاعوں میں تھا۔ ”پلیز ابھی مجھے ٹوکنا نہیں... ورنہ میں بھٹک جاؤں گی... سری لنکا سے واپسی پر میں... ڈاکٹر ہاشم سے معذرت کر سکتی ہوں اگر آپ...“

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا...

بہت دیر بعد وہ اس فقرے کی شدت اور یک لخت آمد کے ٹکراؤ سے باہر آیا... سلطانہ کی خانہ بدوش نیلگوں آنکھوں کی ہمزاد و نیلی بناوٹیں جیسے اس کے چہرے سے الگ ہو کر چونے کی سفیدی میں ابھرے ہوئے مجسموں کے گرد طواف کرتی انہیں اپنے رنگ میں بھگونے لگیں... بھڑکتی روشنی بھی نیلاہٹ میں رنگنے لگی...

”میں تو...“ ایک پیدائشی طور کلنت زدہ بچے کی طرح خاور بجز اور حیرت سے لڑکھڑانے لگا... ایک کند ذہن طالب علم کی مانند گھبرا گیا... ”میں تو... آئی ایم سکسٹی... ایک عمر رسیدہ شخص ہوں... قربت مرگ میں ہوں... تو...“

”اور میں قربت محبت میں ہوں... میں اپنے ماضی کے تجربوں کو آواز نہیں دینا چاہتی کیونکہ بہت شور ہو گا... بازگشت ایسی ہو گی کہ کان بہرے ہو جائیں گے... بے شمار قصے واپس آئیں گے اور ان میں سے کچھ میں تمہیں سنا بھی چکی ہوں... میں نے بہت آوارہ گردی کی ہے لیکن میں تمہارے مقام پر ٹھہر جانا چاہتی ہوں... میرے لئے نہ مرگ وجود رکھتی ہے اور نہ تمہاری عمر...“

”اور نہ اس ہاتھ پر ابھرتی جھریوں کا نیم مردہ جھرمٹ...“

”نہیں... وہ مجھے اب دکھائی نہیں دیتے... یہ درست ہے کہ جرابوں اور ادنیٰ ٹوپوں والے کاؤنٹر سے ہٹ کر کورڈ مارکیٹ کے اندر جب میں نے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے یہ سب کچھ نظر آیا تھا جو بیٹے برسوں نے تمہارے چہرے پر چھوڑا تھا... یہ درست... تمہاری عمر تمہارے سراپے پر درج تھی... لیکن مرگلا پہاڑیوں میں جو شام ہوئی تھی اور پھر رات اتری

ہوا کے بے لگام بگولے خیمے کو لیک نالتواں جھاڑی کی مانند جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ خیمے کی کچھ میخیں ریت میں سے باہر آچکی تھیں۔ ریت میں میخ اگرچہ گہرائی تک اتر جاتی ہے مگر اس کی پکڑ میں گرفت نہیں ہوتی۔ اور خیمے کے فلیپ دوہرے ہو کر بے تاب دستکیں دیتے تھے۔ ریت پر اپنے ہاتھ مارتے تھے اور کبھی پردے پر تیز بارش کی طرح برستے تھے۔

اُس رات میں پہلے تو نہ ہوا تھی اور نہ کوئی سرگوشی۔ سوائے سندھ کے بہاؤ کے۔ انڈس کوئین کو رخصت کر کے خاور اپنے خیمے میں آکر لیٹ گیا تھا۔ اور اس لمحے اتنی خاموشی اور ایسا ٹھہراؤ تھا کہ خیمے سے دور کنارے کے ساتھ لنگر انداز کشتی کے فرش پر اپنا جڑا کھولے لیٹی کاکھٹی کے خزانے بھی سنائی دیتے تھے۔ نہ ہوا تھی اور نہ کوئی سرگوشی۔ سوائے سندھ کے بہاؤ کے۔ اور سندھ سائیں ایک بوڑھی عورت کے چرنے کی طرح بہت مدھم رُوں رُوں کرتا بہتا تھا۔

انڈس کوئین کو رخصت کر کے وہ اپنے خیمے کی علیحدگی اور تنہائی میں یہ حساب کرتا رہا کہ آج کیا تاریخ ہے اور سلطانہ کتنے روز بعد کو لمبو سے واپس آئے گی اور اسلام آباد ایئرپورٹ کے لاؤنج میں سے باہر آرہی ہوگی۔

اور کیا وہ اقرار ایک وقتی اہال تھا۔ اس ایک لمحے کی طرح جب وہ اس کی جیب کی رقم کا حساب مانگتی تھی اور بعد میں شرمندگی اور شک سے دوچار ہوتی تھی۔ ایک عارضی اور جذباتی لاد تھا جس نے وقت کی ڈھلوان پر بہتے ہوئے کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو جانا تھا۔ لگاؤ میں کتنی گہرائی تھی۔

واپسی کا سفر بہاؤ کے ساتھ تھا اور وہ ایک دوروز میں غازی گھاٹ پہنچ سکتے تھے۔ اور وہاں سے اسلام آباد۔ لیکن یہ بھی عین ممکن تھا اس کی خصلت سے مطابقت رکھتا تھا کہ وہ واپس آئے تو پھر سے ٹھنڈی اور لا تعلق ہو۔ سب کچھ بھول چکی ہو۔ اسے یاد دلایا جائے تو وہ کہہ دے کہ میں تو اس لمحے میں سنوپا کے سات آسمانوں تلے لائٹن کی روشنی میں۔ وہاں تھی ہی نہیں۔ اس کا تذکرہ مت کرو۔ تو پھر کیا ہوگا۔ وہ اکثر وہاں نہیں ہوتی تھی جہاں وہ ہوتی تھی۔

کروٹیں بدلتے، سلیپنگ بیگ میں کروٹیں بدلتے سندھ کی مدھم رُوں رُوں کی آہستگی نیند کا ہزار پایہ لے آئی جو اس پر غالب آتا گیا۔ اس نیند کے اندر کہیں اس کی سٹڈی

تھی اور پھر مارکیٹ کے چوک سے مڑتے ہوئے۔ تب تک۔ وہ سب کچھ۔ معدوم ہو گیا تھا اور تم صرف ایک شخص تھے۔ جس کی رفاقت میں زندگی میں پہلی بار۔ میں خوش تھی۔ اطمینان میں تھی۔ جیسے میں اپنے باپ کی رفاقت میں ہوا کرتی تھی۔

اوپر۔ مختصر کمرے کی چھت تک۔ سات آسمان تھے۔ سات سُر تھے۔ سات رنگ اور ساتھ کیفیتیں تھیں اور سلطانہ مہاتما کے نروان کو اپنی انگلیوں میں جذب کرتی بولتی تھی۔ ”سنو۔۔۔ نہ اس ہاتھ پر ابھرتی جھریوں کا جال۔ اور نہ تمہارا زوال۔ اور نہ تمہارے رخساروں کا ماس جو ڈھیلا ہوتا ہے اور نہ وہ سانس جو اکھڑتا ہے اور نہ ہی وہ آنکھیں جو بے دم ہوتی ہیں۔۔۔ ان کی میرے لئے کوئی حیثیت نہیں۔۔۔ ہاں یہ تو ممکن ہے اور تمہیں اختیار ہے کہ میرا جو بچ ہے وہ تمہارا بچ نہ ہو۔۔۔ اور میں تم سے جواب نہیں مانگوں گی۔ صرف یہ ہے کہ اگر سری لکا سے واپسی پر۔۔۔ تم ایئرپورٹ پر موجود ہوئے تو۔۔۔ میں ڈاکٹر ہاشم کو انکار کر دوں گی۔۔۔“

آخری بار پھر پھڑا کر لائٹن کی بتی بجھ گئی۔ لیکن سنوپا کے ساتوں آسمان چھت تک جاتے ہوئے ایک ہلکی نیلاہٹ میں گھلتے جا رہے تھے۔

خیمہ ہوا کے شرالٹے بھرتے تیز و تند بگولوں کی گرفت میں آیا ہوا ایک جال میں جکڑے پرندے کی طرح بے بس اور بے حساب پھڑپھڑاتا تھا۔ اس کی پھڑپھڑاہٹ مسلسل تھی اور سانس نہ لیتی تھی۔ وہ ایک جل مرغی تھا جس کے پنجے ایک ڈور سے جکڑے ہوئے تھے اور وہ پھڑپھڑاتا تھا کہ میں اس سے چھوٹ جاؤں۔

ان ہواؤں کے دباؤ سے خیمے کا کپڑا ہچکچاتا تھا۔ اور پھولتا تھا۔ اس کی چھت ہوا کے بوجھ سے نیچے آتی تھی اور خاور اپنے سلیپنگ بیگ میں لیٹا دونوں ہاتھ بلند کئے اسے سہارتا اپنے اوپر گرنے سے بچاتا تھا۔

باہر کبرام برپا تھا۔

فہیم کی دیگیچیاں اور برتن۔۔۔ سرور کی پرات۔۔۔ اڑتے پھرتے تھے۔۔۔ گرتے تھے اور پھر لڑھکتے ہوئے کسی سخت شے سے ٹکرا کر چیخنے لگتے تھے۔۔۔ الاؤ کی جلی بھی ٹہنیاں ہوا کے زور سے گھومتی ہوئی خیمے کے پردے سے ٹکراتی تھیں۔

کے بک شلیف کے پیچھے سے دیوار اور کتابیں مسمار کرتا بل ڈوزر کا بلیڈ نمودار ہوتا ہے اور وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنا پورا زور لگا رہا ہے۔ بل ڈوزر بھی ایک ٹیل کی مانند بے پناہ قوت اپنے آہنی بدن میں رکھتا ہے اور وہ ایک ناقوس بل فائٹر کی مانند اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے۔ اسے پیچھے دھکیلنے۔ اپنی ذات کے نہاں خانے سنڈی کو بچانے کی تگ و دو میں ہے۔

یہ کشمکش جاری تھی جب سکوت ٹوٹا اور باہر ایک سرسراہٹ کا آغاز ہوا جو لمحوں میں شر لانے بھرتی تیز ہواؤں میں بدلی اور اس کا خیمہ پھڑپھڑانے لگا۔ رات کا جانے کونسا پہر تھا۔ خیمہ جیسے پہلے آب رواں پر خاموشی سے بہتا تھا اور اب کسی سمندری طوفان کی زد میں آ کر دباؤ کی شدت نہیں سہارتا تھا اور ایک ٹین کی مانند پچکتا تھا۔ پہلے تو وہ اس یک لخت موسمی تغیر سے لطف اندوز ہوا۔ آوازوں اور مہیب شرلاؤں کو غور سے سنتا سلیپنگ بیگ میں لیٹا آنکھیں کھولے تبدیلی کے عمل کو غور سے سنتا رہا۔ پھر ان میں کسی ناگہانی ایسے کی صداؤں کا عنصر جنم لینے لگا۔ ان سے خوف آنے لگا۔

خیمہ اس کے دونوں ہاتھوں سے سنبھلتا نہ تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بازو سیدھے کر کے خیمے کے پچکتے اور دباؤ سے مجبور ہو کر ڈھے جانے کے قریب وجود کو سہارا دینے کی کوشش کرنے لگا۔ خیمے کا میٹوں سے آزاد کپڑا اس کے ماتھے سے ٹکرا کر چہرے سے چمٹتا تھا۔

باہر۔ دیگچیاں اور پراتیں اور چائے کے مگ اڑتے پھرتے تھے۔ رنوں سے بندھی کشتی بار بار کنارے سے ٹکراتی تھی اور اتنی شدت سے ٹکراتی تھی کہ اس کی دھمک ریت میں جذب ہو کر خیمے کے اندر اس کے بدن تک پہنچتی تھی اور اس سے ٹکراتی تھی۔

سرور اور ملاں جعفر بھاگتے پھرتے تھے۔ وہ کشتی کے آزاد ہو کر سندھ میں کھو جانے سے خوفزدہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے شور مچا رہے تھے۔ فہیم کی آواز بھی آتی تھی۔ ہوئی کی شدت میں کمی نہیں آرہی تھی۔

”پلیز کم ان۔“

ساتویں منزل پر ایک طویل اور خاموش راہداری کے آخر میں وہ فلیٹ تھا جس کی

کال ٹیل بہت دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد ’تذبذب اور فیصلہ نہ کر سکنے کی اذیت کے بعد۔۔۔ خاور نے بجائی تھی۔۔۔

ایئر پورٹ سے وہ سیدھا جناح ہو سہٹل پہنچا تھا۔ اسے کچھ کچھ یاد پڑتا تھا کہ ٹیلیفون پر آخری بار گفتگو کرتے ہوئے جب کہ اس کی آواز ایک بھراہٹ میں بدل چکی تھی، اس نے شاید جناح ہو سہٹل کا نام ہی لیا تھا۔ یا کوئی اور پرائیویٹ ہو سہٹل تھا جہاں سے وہ بول رہی تھی اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی لاغر اور خرخراہٹ والی تھی کہ فقرے سمجھ میں نہ آتے تھے۔

استقبالیہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی تھکاوٹ میں ڈوبی مکاکی مسکراہٹ والی سسٹر نے نہایت اہتمام سے پرائیویٹ کمروں میں داخل مریضوں کی فہرست چیک کی۔ دوبارہ وہ حیان سے چیک کی اور سر ہلایا ”آئی ایم سوری لیکن۔۔۔ نہیں سر۔۔۔ مسز عابدہ سومرو کے نام کی کوئی پشٹ یہاں ایڈمٹ نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں ہے کہ۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ ان کی حالت اچھی نہیں تھی تو۔۔۔“
سسٹر نے ایک اور رجسٹر اٹھا کر اس پر ایک سرسری نظر ڈالی ”نہیں سر۔۔۔ ان دو چار دنوں میں اس نام کی کوئی ڈیجھ بھی نہیں ہوئی۔“
”آ۔۔۔ کین آئی میک اے کال پلیز۔۔۔ اے لوکل کال۔“

”پلیز گواہیڈ۔“

سسٹر نے فون اٹھا کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

عابدہ کے کمرے سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ وہاں موجود نہیں

تھی۔

اسے اپنی شدید ابتر طبیعت اور حماقت کا احساس ہوا۔ یوں منہ اٹھا کر کراچی چلے آنے سے پیشتر اسے کسی نے کسی طور چیک تو کر لینا چاہئے تھا کہ وہ کہاں اور کس ہو سہٹل میں ایڈمٹ ہے۔۔۔ وہ اپنے آپ کو کوستا ہو سہٹل سے باہر آ رہا تھا جب اسے ساتویں منزل پر واقع اس فلیٹ کا خیال آیا جس کی کھڑکی کی چوکھٹ پر سورج تادیر انکار ہا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جس رہائشی کو مپلیکس میں وہ فلیٹ واقع ہے وہ کہاں ہے۔ سوائے اس کے کہ اس کی کھڑکی کا رخ سمندر کی جانب ہے۔

ایک ٹیکسی پر سوار ہو کر اس نے ایک بظاہر بے مقصد اور طویل سفر کیا۔ درجنوں بلکہ سینکڑوں ایسی عمارتوں کو جانچا جو ساحل کے ساتھ چلی جاتی تھیں۔ بار بار اترا۔ ہر بلڈنگ کو پہچاننے کی سعی کی۔ اس کے محل وقوع کا اندازہ کیا۔ کسی سے پوچھا بھی نہیں جاسکتا تھا اور کیا پوچھتا۔۔۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ ٹیکسی کی ونڈ سکرین کے سامنے ”پپی ٹوڈلرز نرسری“ کا بورڈ آیا اور گزر گیا۔ اسی نرسری کے سامنے وہ عمارت تھی۔

”پلیز کم ان۔۔۔“

دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔

”آئی ایم سوری بٹ۔۔۔ میرا نام خاور ہے اور میں اسلام آباد سے آیا ہوں۔۔۔ اور

عابدہ۔۔۔“

”میں آپ کو جانتی ہوں۔۔۔ آپ اندر آجائیں۔“

یہ وہی فلیٹ تھا جس کے اندر داخل ہونے پر اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے مکین کی سانسیں ابھی تک وہاں موجود تھیں۔ یہی مکین تھی جو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سندھ کا ایک چھڑکاؤ۔ ڈیکور مغربی۔ پینک کے سرہانے ایک سکوت میں آیا ہوا چوبی مور۔۔۔ اور ماند پڑتے ہوئے سات آئینے۔

”میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ میں عابدہ کے بہت نزدیک ہوں۔۔۔ اس کی کوئی بات زندگی کا کوئی بھی رخ مجھ سے چھپا نہیں ہوا۔ اس لئے میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔۔۔ میرا نام شہلا آفریدی ہے۔۔۔“

وہ ایک نہایت نئی تلی اور ہر شے سے آگاہ اور سنجیدہ شخصیت کی مالک عورت تھی۔ خاور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ سپاٹ رہا۔ جیسے کسی پتھر کو سامنے پایا ہو۔ وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کے لئے وہ کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اس کے لہجے میں سے کہیں کہیں ناپسندیدگی کا عنصر جھلکتا تھا۔۔۔

”پلیز میک یور سیلف کمرٹ ایبل۔۔۔“

”تھینک یو“ وہ جھجکتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا ”عابدہ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”نہیک ہے۔۔۔“ نہایت سرد لہجے میں اس نے کہا اور پھر اس کے سامنے سندھی

جھولے پر بیٹھ کر جھولنے لگی۔ ”آپ ایک ادھیڑ عمر کے مرد ہیں آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔۔۔“

”جی۔۔۔“

”اگر ایک نوجوان لڑکی جسے اپنے حواس پر اختیار نہیں آپ سے رابطہ کرتی ہے، آپ سے محبت کا اظہار کرتی ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ اس کے لائق نہیں اور آپ کو پیچھے ہٹ جانا چاہئے تھا۔۔۔“

”جی۔۔۔ شاید ایسا ہی ہونا چاہئے تھا اور میں نے۔۔۔ اس کی طبیعت کیسی ہے، میں صرف اس کا حال جاننے کے لئے یہاں آیا ہوں۔۔۔“

”میں آپ کے لئے کافی بنا کر لا سکتی ہوں۔۔۔“

”جی نہیں، شکریہ۔۔۔“

”عابدہ ایک کامپلیکسڈ چائلڈ ہے۔۔۔ وہ اپنے ننگے پاؤں سے قالین پر دباؤ ڈال کر جھولے کو جھلانے لگی۔ ”یہ آپ کے لئے ایک شاک ہو گا لیکن وہ مکمل طور پر صحت مند ہے۔۔۔ اسے کوئی بیماری نہیں۔۔۔ لیکن اس کے کچھ واسے ہیں۔۔۔ اور وہ سمجھتی ہے اور ان لمحوں میں تہہ دل سے یہ سمجھتی ہے، جھوٹ نہیں بولتی کہ۔۔۔ وہ طرح طرح کی خوفناک بیماریوں کا شکار ہے۔۔۔ مر رہی ہے اور کوئی اس سے محبت نہیں کرتا، پرواہ نہیں کرتا۔۔۔ یہ اس کے نفسیاتی عارضے ہیں جن سے میں بخوبی واقف ہوں۔۔۔ کیا آپ کو بھی اس نے اپنی عزیز ترین سہیلی کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔۔۔ بتایا ہو گا۔۔۔ وہ میں ہوں۔۔۔ میرا کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا لیکن وہ ایک مکمل وار فکلی میں چلی جاتی ہے اور یقین کر لیتی ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔۔۔ میری لاش کو دیکھتی ہے، اس پر رو کر ہلکان ہو جاتی ہے، شدت غم سے بیمار پڑ جاتی ہے۔۔۔ بے ہوش ہو جاتی ہے۔۔۔ مجھے دفن کر آتی ہے۔۔۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی تفصیل بتاتی ہے جن سے وہ کبھی ملی بھی نہیں ہوتی۔۔۔ ایسی انٹرنیشنل یونیورسٹیوں میں پڑھ چکی ہوتی ہے جن کے نصاب سے بھی وہ واقف نہیں ہوتی۔۔۔ اسے البتہ دنیا کے بڑے بڑے ہسپتالوں اور مشہور ڈاکٹروں کے ناموں کا پتا ہے۔۔۔ اور کبھی کبھار وہ کسی ایسے شخص کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو جاتی ہے جسے اس نے کبھی ٹیلی ویژن پر دیکھ لیا ہو۔۔۔ کسی اخبار میں اس کی تصویر نظروں سے گزر گئی ہو۔۔۔ مجھے آپ سے یہی شکایت ہے کہ آپ نے اپنی عمر کو نہیں

دیکھا اور مردانہ انا پرستی کے زعم میں اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔
یہ عورت... سندھی جھولے پر آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی.. نئی تلی.. ہر شے سے
آگاہ جو کچھ کہہ رہی ہے کیا یہ حقیقت ہے.. یا یہ خود کوئی نفسیاتی مریضہ ہے جس کے اپنے کچھ
واپس ہیں... کیا پتا عابدہ ایک حقیقت ہو جسے یہ ایک واہمہ بنا کر پیش کر رہی ہے..
"اس کے پورے بدن پر نیلے دھبے اور کھربند تھے... وہ تو واہمہ نہیں.."
"نہیں.. وہ ایک عام سکن الرجبی کے آثار ہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں..."
"وہ کسی بھی ایسے مرد کے عشق میں مبتلا ہو جاتی تھی جو..."
"ہاں..."

"اور مرد بھی تھے؟"

"ہاں..."

"آپ اس کی نفسیاتی کمزوریوں سے آگاہ تھیں اور اس کے باوجود آپ نے یہ
فلیٹ اس کے سپرد کر دیا..."

"میں کر بھی کیا سکتی تھی.. وہ واقعی ان وقتوں میں آپ کی شخصیت میں پوری
طرح الجھ چکی تھی.. آپ کے عشق میں اس بری طرح سے گرفتار تھی کہ اپنے خاوند اور بیٹی کو
بھی چھوڑ دینا چاہتی تھی.. میں جانتی تھی کہ یہ ایک عارضی پڑاؤ ہے، وہ زیادہ دیر یہاں قیام
نہیں کرے گی.. میں اس کے ساتھ بحث نہیں کر سکتی تھی، اسے روک نہیں سکتی تھی کہ ان
وقتوں میں وہ واقعی مکمل طور پر آپ کے ساتھ کو مہذب تھی اور اگر میں یہ فلیٹ آپ دونوں کے
لئے خالی نہ کرتی تو میں اسے کھو دیتی... اور وہ اتنی پیاری اور عزیز چیز ہے اور اتنی معصوم ہے کہ
میں اسے کھونا نہیں چاہتی تھی... میں آپ کے لئے کافی بنا کر لا سکتی ہوں.."
"نو تھینکس..."

سورج ذرا نیچے ہوا اور شیشے کی کھڑکی کے کنارے پر اٹک کر پورے فلیٹ کو
چکا چوند کر دیا.. ایک سمندری پرندہ آہستگی سے پر ہلاتا سرچ گولے میں داخل ہوا.. تادیر اس
میں ہولے ہولے پرواز کرتا رہا اور پھر نکل گیا.. عشق کا سرسبز ذخیرہ دیر ان تھا.. اس میں نہ
کوئی مور بولتا تھا اور نہ جن کے ساتھ چمن میں بچے پلنگ پر کوئی گلے لگ کر سوتا تھا..
"وہ کہاں ہے؟"

"اس وقت؟... اپنے خاوند کے ساتھ... امریکہ میں... اپنی بیٹی کے ساتھ.. دو
روز ہو گئے ہیں۔"

"اور وہ صحت مند اور خوش ہے؟"

"ہاں... اور فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے.. اور اس نے کبھی آپ کا حوالہ
نہیں دیا.. وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے جا چکی ہے جہاں آپ تھے.. میں آپ کے لئے کافی کا
ایک کپ بنا کر لاتی ہوں..."

دھمک... دھمک... ٹھک... ٹھک...

کشتی تیز ہواؤں کے آگے بے بس سندھ کے پانیوں پر ڈولتی کھونٹے سے بندھے
کسی اڑیل تیل کی مانند کناروں کے ساتھ سر ٹکراتی تھی.. جیسے اکلوتے بیٹے کی مرگ پر ایک
ماں اس چوکھٹ پر سر پٹختی ہے جسے پار کر کے وہ آخری بار گھر سے نکلتا تھا۔

خاور ایک سیمن کی طرح جو معبد کے ستونوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا، خیمے کو
سہارا دیتا تھا اور باہر فہیم کی دیگچیاں اور سرور کی پرات ہواؤں میں اڑتی پھرتی دھنیں بجاتی سنائی
دیتی تھیں..

ہواؤں کی شدت میں تو کمی نہ ہوئی البتہ اس کے بازو تھک گئے... اور اس کا سر نیند
سے بو جھل ہونے لگا... کشتی ہوا میں معمول ہو گئیں۔

سرور اور ماماں جعفر کشتی کو قابو میں رکھنے کی سعی کرتے.. گال مندا کرتے ہواؤں
کے سنگ ان کے سر میں سُرماتے شور کرتے تھے..

دریا کے ریتلے کنارے ایک مہیب آواز کے ساتھ پانیوں میں گرتے تھے.. جیسے
ان میں کسی نے چھلانگ لگا دی ہو.. ان کا ریتلا بوجھ پانی میں گرنا تھا اور ہولناک گونج کو جنم
دے کر گم ہو جاتا تھا..

نہیں ہے... نہیں ہے سائیں.. یہ کون پکارتا تھا..

نیند کی مد ہوشی میں... سلیپنگ بیک میں سر لپیٹے بدن کی تھکن اور پچھلی رات
کے جگراتے میں.. اس نے بمشکل کروٹ بدلی..

ہاں وہ فون پر مجھ سے بات کرتی رہتی ہے.. اس نے کبھی آپ کا حوالہ نہیں دیا.. وہ وہاں سے کوچ کر کے آگے جا چکی ہے جہاں آپ تھے..

سائیں ہم تو آپ کے مرید ہیں، آپ کی چوکھٹ پر حاضری دینا چاہتے ہیں.. حکم کریں سائیں..

جھکڑ اور تیز ہوائیں صبح تک چلتی رہیں.. ان میں کمی نہ آتی تھی.. پو پھنی تو جیسے وہ اسی کی منتظر تھیں.. یکدم سکون ہو گیا.. ہر شے اٹھل پٹھل اور بے چینی اور بے اختیاری سے نکل کر سکوت میں آ گئی.. سب کچھ ٹھہر گیا.. کشتی کناروں سے ٹکرا کر اب ایک نامراد عاشق کی طرح سستار ہی تھی.. جنوں رخصت ہو چکا تھا.. سب چہروں پر ریت اور ہواؤں کی تندہ کی نشانیاں تھیں اور پونے ان کے بوجھ سے بمشکل کھلتے تھے... برتن اور دیگیں.. پچکے ہوئے.. فہیم سر جھکائے انہیں جھاڑیوں میں تلاش کر رہا تھا..

کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی مردہ مچھلیاں پڑی تھیں.. کہیں کہیں کسی ایک کی دم لہ بھر کے لئے پھڑکتی..

سرور نے بانس پانی کے سینے میں اتارا.. کشتی نے کنارے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پرے کیا اور سندھ کے بہاؤ میں آ گئی..

ابھی پو پھٹ رہی تھی.. نیم تاریکی بہت سچے سے منظر کا دامن چھوڑ رہی تھی.. اس کی آنکھوں میں بھی ریت اور نیند کے جھوکے تھے.. پونے کھلتے نہ تھے..

”میں آرام کرتا ہوں فہیم.. مجھے ڈسٹرب نہ کرنا“

”ٹھیک ہے سائیں... رات بہت بے آرامی رہی.. آپ ریٹ کرو“

سندھ کی ندیاں دیرے دیرے بہتی تھیں اور کشتی اسی دھیرے سے اس میں بہتی تھی اور خاور اس کے ہلکوروں میں اپنے بدن کے تھکاؤ اور جگرات کو زائل کرنے کے لئے داخل ہوا اور عارضی موت کے تجربے کے اندر اترتا گیا..

ان گنت عارضی پڑاؤ تھے جو غازی گھاٹ سے بھٹنے کے بعد رات کے بیسروں کے لئے آئے.. سروٹوں کے گھنے ذخیرے.. ریتلے ٹاپو.. بے آباد جزیرے.. پرندوں کی چراگاہیں.. ایسے ٹیلے جن پر صرف ایک دو خیمے بمشکل جگہ پاتے تھے اور فہیم احتیاط سے جھومر ڈالتا تھا کہ کہیں پانی میں نہ گر جائے.. یہ سب عارضی پڑاؤ تھے اور وہ انہیں اپنی ضرورت کے مطابق استعمال

کرتے تھے.. ان کی ریت کو روندتے تھے، الاؤ جلا کر ان کے بدن کو سیاہ کرتے تھے.. خالی ڈبے، پلاسٹک کی بوتلیں.. ہڈیاں.. شاپر.. ان کے کنوار پن پر بکھیر کر انہیں چھوڑ دیتے تھے..

اور جب اگلا پڑاؤ آتا تھا تو پچھلا پڑاؤ انہیں یاد بھی نہیں رہتا تھا..

میں جانتی تھی کہ یہ ایک عارضی پڑاؤ ہے، وہ زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرے گی.. عابدہ سومرو نے بھی اسے استعمال کیا تھا.. اس کے بدن پر جھوٹ اور نفسیاتی عارضے کے الاؤ جلا کر اسے شب بھر کے لئے استعمال کیا تھا.. اسے یو قوف بنایا تھا اور وہ بن گیا تھا.. شہلا آفریدی درست کہتی تھی.. ایک ادھیڑ عمر کے مرد کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا.. پیچھے ہٹ جانا چاہئے تھا..

لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی..

پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا..

انسان ہمیشہ سے ایک عارضی پڑاؤ رہا ہے... ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ دوسرے قصور دار ہیں... اس کی بیوی کو اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا.. وہ زندگی کے ایجنڈے میں ایک آئٹم تھا جو گھریلو اخراجات کا بندوبست کرتا ہے، بچے پیدا کرتا ہے.. اور یہ بچے بھی اس کے عارضی پڑاؤ میں ذرا ٹھہرے اور کوچ کر گئے.. ان میں سے ہر فرد اس لمحے جب وہ اس میں قیام کرتا تھا انتہائی بے لوث تھا اور اس سے محبت کرتا تھا.. اس قیام کے دوران کہیں کوئی خود غرضی شامل نہ تھی.. اس کی بیوی نے بھی اسے بہت احتیاط اور لگن سے سنبھال سنبھال کر رکھا تھا.. بچے بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے اور ان کی ہانہوں کا لمس اس سے جدا نہ ہوتا تھا.. لیکن وہ ایک عارضی پڑاؤ ہی تھا.. اگر عابدہ سومرو نے بھی اسی تسلسل میں اسے استعمال کیا.. اگرچہ ان لمحوں میں اس کی محبت میں بری طرح الجھی رہی.. تو یہ پہلی بار نہ تھا..

اور غلامی آنکھیں بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی تھیں.. وہ بھی تو ایک غلام ڈھونے والے سمندری جہاز کے کیپٹن کی طرح تھی جو اپنے خاوند اور بچوں کے عارضی پڑاؤ سے نکل کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر کے چلی جاتی تھی..

سلطانہ کی زندگی میں بھی ایسے ان گنت پڑاؤ تھے.. اپنے کچے گھر کے صحن میں سائیکل کی گھنٹی پر اپنا ننھا منا انگوٹھا رکھتی ہوئی.. اوڑک کے باغوں میں.. امریکہ کے فٹ پاتھوں

میں وہ ہمواری برقرار نہ تھی.. وہاں کچھ تلاطم کچھ ہلچل اور کروٹیں تھیں..
”کدھر فہیم“

”سائیں وہ غوطہ لگا گئی ہے.. ابھی ابھرے گی.. بس نظر بھر کر دیکھتے رہو.. جدھر ڈوبی ہے اوھر سے ذرا آگے نظر رکھو.. سانس لینے کے لئے اوپر آئے گی اور نظارہ کرائے گی..“
کشی آپو آپ اپنی من مرضی سے ڈولتی بہتی جاتی تھی..
وہ آرگوس کے سحر زدہ ملاح تھے جنہوں نے سائرز کے گیت سن لئے تھے..

ایک مدت گزر گئی.. اس کی ریت بھری آنکھیں تھکنے لگیں..
صرف کچھ تھی جو اس انتظار میں شامل نہیں تھی.. باہن کو دیکھنے کی چاہت نہ رکھتی تھی.. وہ اس گہما گہمی سے لا تعلق کشتی کے پچھلے حصے میں گونٹھ مارے حسب معمول اپنا جھگاٹھا کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی.. صرف ایک بار اس کی سیاہ آنکھوں نے اس تک سفر کیا لیکن اس کے سانسوں کی ہواڑ میں اب دعوت کی وہ گرمی نہ تھی کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ اس سائیں میں وہ بات نہیں ہے جو اسے میل کرنے پر مجبور کر دے..

کر نہیں تیز اور روشن بحالوں کی طرح پانی میں اتر کر بجھتی جاتی تھیں.. اور اسی پانی میں سے یکدم آنکھ کے جھپکتے ہی ایک سرمئی رنگت کی پشت کا ابھار بلند ہوا.. آبی چادر کی ہمواری چاک ہوئی اور اس میں سے انڈس ڈولفن کا ناپیدنا وجود ابھرا.. اس کی گیلی پشت پر کر نہیں پھسلتی گئیں..

خاور کا دم رک گیا.. یہ ایسا پر شکوہ منظر تھا.. آنکھوں میں ریت کے جو ذرے تھے وہ موم ہو گئے اور اب وہ کوشش بھی کرتا تو اپنے پپونوں کو جھپکا نہیں سکتا تھا..

ڈولفن ابھرتی گئی.. گیلے بدن پر سورج کو وصول کرتی ہوئی.. روشن ہوتی ابھرتی گئی اور پھر اس کی اندھی تھو تھنی پل بھر کے لئے پانیوں سے باہر آئی اور پھر اسی پل میں وہ تمام کی تمام پھر سے ڈوب گئی.. آبی چادر پر اس کے عارضی پڑاؤ کے چند ہلچلے اور لہریں باقی رہ گئیں جو فوراً ہی ہموار ہو کر اس کی موجودگی کے امکان سے منحرف ہو گئیں..

”اب اوھر نظر کرو سائیں..“ فہیم نے وہاں سے نگاہیں ہٹائیں اور کشتی کے عین برابر میں اپنی توجہ مرکوز کی.. ”اوھر آئے گی“

اور وہی ڈولفن اب کے ابھری تو کشتی کو تقریباً اپنے کندھوں سے دھکیلتی پانی سے

پراوندھی پڑی قہقہے لگاتی اور ایک ایرانی ٹیکسی ڈرائیور کے ایک فقرے کی سچائی پر ایمان لا کر اپنی زندگی کا نقشہ بدلتی ہوئی.. جو ڈاکٹر ہاشم کے عارضی پڑاؤ سے اٹھ کر اس کی خیمہ بستی میں آنے کو تیار تھی.. اور اس عمر میں اس کا پڑاؤ تو قدرتی طور پر بے حد عارضی تھا..
ہر انسان یہی سمجھتا ہے کہ وہ عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہو جب کہ دوسروں کو اس سے بھی یہی شکایت ہوتی ہے..

”باہن ہے... باہن ہے سائیں.. یہ کون پکارتا تھا..“

خاور نے کروٹ بدل کر اس آواز پر کان دھرا اور ابھی تک ریت بھری آنکھوں کے پپونوں کو اوپر کیا.. کشتی کے پلیٹ فارم پر سرور اور جعفر کے سیاہ پاؤں نہیں تھے فہیم جھکا ہوا تھا.. ”سائیں آپ کو ڈسٹرب کیا ہے مگر جاگ جاؤ.. کیا خوش بخت دیہاڑا ہے.. سندھ سائیں کے سینے پر اندھی ڈولفن ابھرتی ہے اور نظارہ کراتی ہے.. سائیں باہر آ کر دیدار کرو.. منظر کشتی کرو..“

خاور باہر آ گیا..

سندھ سائیں کا وسیع حوصلہ مند سینہ ہموار تھا.. پانیوں کی ایک کچھ کچھ بہتی چادر تھی جس پر پو پھننے کے بعد ابھی ابھی سورج کی زرد کرنیں اتری تھیں اور اس چادر کو نیم سنہری رنگتی تھیں.. جہاں تک نظر کام کرتی تھی وہاں تک صرف پانیوں کی کسمپاسی چادر تھی اور اس پر کوئی ایک لہر.. کوئی ایک کروٹ دکھائی نہ دیتی تھی..

”ابھی نظر نہیں ہٹاؤ سائیں.. دیکھتے رہو.. دیدار کرائے گی سائیں..“ فہیم بُت بنا.. آنکھوں کو پتھر کئے اُدھر تکتا جا رہا تھا.. سرور اپنے بانس کو ٹھولے ایک عقیدت اور حیرانی کو اپنے سیاہ چہرے پر نقش کئے پانی کی ہموار اور ابد تک جاتی چادر کو دیکھتا جاتا تھا.. آنکھیں نہیں جھپکتا تھا.. جعفر بھی اسی حالت میں تھا.. وہ دونوں پانیوں کو ایسے تکتے تھے جیسے ان میں سے خواجہ خضر کا ظہور ہونے کو ہے..

”نظارہ کرو سائیں..“ فہیم یکدم چیخا اور سندھ کی چادر کے جس حصے پر خاور نظریں جمائے ہوئے تھا اس سے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا..

جتنی دیر میں پلیٹ کر اس نے اوھر نگاہ کی.. وہاں کچھ بھی نہیں تھا.. البتہ وہاں چادر

نکلی... اس کی تھو تھنی باہر آئی تو بے چراغ اور بے نور تھی..

وہ انہیں دیکھ نہیں سکتی تھی، محسوس کر سکتی تھی کہ وہ وہاں ہیں..

وہ ڈولفن اگرچہ چند لمحوں کے لئے نمودار ہوئی لیکن اس کی نظروں کے سامنے وہ جیسے ساکت ہو گئی... وہی سی آہ پر چلنے والے کسی نظر کی مانند ریوٹ کا مٹن دبانے سے ٹھہر گئی... تصویر ہو گئی.. اور پھر دوبارہ اسی مٹن کے دبانے سے متحرک ہو کر غراپ سے پانیوں میں ڈوب گئی.. یہ ڈولفن آپر کا آغاز تھا..

پانیوں کے اندر جانے وہ کتنی تھیں..

پھر سندھ کی آبی چادر تار تار ہونے لگی.. وہ جا بجا ابھرتی تھیں.. شعاعوں کی زد میں آکر روشن ہوتی تھیں اور پھر ڈوب جاتی تھیں..

جیسے وہ ایک پر فار منس دے رہی ہوں.. سدھائی ہوئی ہوں.. اور صرف ان کے لئے جو ایک کشتی پر سوار ان کی آماجگاہ میں آنکلتے تھے، پر فارم کر رہی تھیں..

ان کے رنگ سرمئی تھے.. لیکن کشتی سے دور ایک طویل فاصلے پر ایک بہت بڑی جسامت کی ڈولفن سانس لینے کے لئے پانیوں میں سے باہر آئی تو وہ برف سفید تھی.. وہ کوئی موبی ڈک تھی..

نہیں.. موبی ڈک تو ایک قاتل و ہیل تھی، اس کے اندر کیپٹن اہاب کی ٹانگ کے علاوہ متعدد کشتیوں کے تختے اور ملاحوں کے بدن تھے جنہیں وہ نگل چکی تھی..

اس ڈولفن نے کوئی ایسی واردات نہیں کی تھی..

وہ تو دیکھ بھی نہیں سکتی تھی.. واردات کیسے کر سکتی تھی..

وہ سفید ڈولفن بار بار ایک ہی مقام پر ظاہر ہو رہی تھی اور خاور اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کشتی اس کے قریب ہو جائے.. وہ اس کے لٹکیے سفید بدن میں کوئی ہارپون گاڑ کر... کوئی نیزہ اتار کر اسے مارنا نہیں چاہتا تھا.. بلکہ اسے اپنی نزدیک ترین قربت میں دیکھنا چاہتا تھا.. کہ جب وہ پانیوں میں سے جنم لیتی ہے تو اس کی تھو تھنی پر جہاں اس کی آنکھیں ہونی چاہئے تھیں وہاں اگر کچھ بھی نہیں ہے.. تو کیا اس قربت میں وہ اس کی موجودگی کو محسوس کر سکتی ہے کہ وہ وہاں ہے.. خاور وہاں ہے.. اور اس کا گھر مسمار ہو چکا ہے... وہ بے سہارا اور بے گھر ہے.. اور اس کی حیات ایک عارضی پڑاؤ ہے...

یہ جاننے کے لئے اسے سفید ڈولفن کی ہمسائیگی کی چاہت تھی..

سندھ کے پانی ان کے بار بار ابھرنے سے جیسے ابل رہے تھے..

انہیں سانس نہ آتا تھا کہ ہر لحظہ ان میں سے کوئی ایک ڈولفن سانس لینے کے لئے کھلی فضا میں پہلے اپنی پشت نمودار کرتی تھی اور پھر اپنی تھو تھنی بلند کرتی تھی... ناپیدائی کی بے چارگی سے بلند کرتی تھی... ایک وہیل کی طرح ظاہر ہوتی تھی اور ڈوب جاتی تھی..

سرور اور جعفر جو عام حالات میں گلہریوں کی طرح زُر زُر کرتے رہتے تھے، خاموش کھڑے انہیں تنکے جاتے تھے..

”سرور...“

”جی سائیں..“ وہ گھبرا کر اپنے سکوت میں سے باہر آیا..

”تم پانی کے پونگ ہو.. سندھ سائیں میں سے ہی اپنا رزق نکالتے ہو تو کبھی اسے بھی شکار کرتے ہو..“

”نہ سائیں نہ..“ سرور نے کانوں کی ٹوپی چھو کر جیسے ایک عظیم گناہ کے لئے معافی مانگی.. ”نہ.. باہن کو پکڑنا تو گناہ ہے سائیں... پر کبھی گناہ ہو جاتا ہے.. ہم لوگ رات کے وقت مچھلی کے شکار کے لئے دریا میں جال ڈال کر چلے جاتے ہیں اور جب سویرے وہاں آتے ہیں تو... کبھی سال دو سال بعد ایسا ہو جاتا ہے کہ اس جال میں باہن بھی پھنس جاتی ہے.. اور وہ ہمیشہ مردہ حالت میں ملتی ہے کیونکہ پانی کے اندر باہر آکر سانس لینے کے بغیر وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی... جال میں پھنس کر پوری رات نہیں نکال سکتی اور مر جاتی ہے.. تو ہم تو بہ کرتے ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہوتا.. ہم تو باہن کو بڑا سائیں مانتے ہیں.. کیونکہ جب یہ نظر میں آوے تو ہمیں شکار ملتا ہے.. اس کا دیدار مبارک ہوتا ہے.. جان بوجھ کر کبھی نہیں مارتے... اب سو بھنا زب اس کی قضا لے آوے تو بھی ملول ہوتے ہیں...“

سندھ کی چادر لیرو لیرو ہو رہی تھی..

اس میں ایک مسلسل تناطم کی کیفیت تھی... ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہ تھی.. مگر وہ جا بجا ابھرتی... آنکھیلیاں کرتی.. ذوق ابھرتی.. قلیلیں کرتی تھیں..

”یہ تو اصر گھر بنائے کھڑی ہے سائیں...“ سرور کا جھٹ انہیں دیکھنے کے چہان

سے ذرا کانپتا تھا۔ "ادھر پانیوں کا میل ہو رہا ہے ناں... تو بیچ میں جہاں دونوں دھارے زور کرتے آتے ہیں اور ان کا ملاپ ہوتا ہے تو ادھر کچھ علاقہ ایسا بنتا ہے کہ اس میں پانی کھڑے ہوتے ہیں جیسے گھرے میں ہوں تو ان میں مچھلی بہت آتی ہے اور بلہن جو ہے اسے کھانے کے شوق میں خاص طور پر ادھر آ جاتی ہے.. گھر بنائے کھڑی ہے سائیں.."

ایک اور سست اور لا پرواہ ڈولفن نے پانی میں سے ابھار کیا لیکن اس کی تھو تھنی باہر نہ آئی اور وہ ایک سمندری جہاز کی طرح بہت دھیرے دھیرے پانی میں ڈوب گئی..

اماں جعفر ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا..

وہ ایک ایسا ملاج تھا جو پانیوں کے گہرے بھید نہ کھولنے کا وچن دے چکا تھا اور کچھ نہیں بولتا تھا.. کبھی اپنی حیاتی میں بہت کچھ دیکھ چکی تھی.. اُس کے بدن کی ریت بہت بار عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال ہو چکی تھی اور وہ بھی کچھ نہیں بولتی تھی 'بچے کو چٹائے بیٹھی تھی..

"اماں... سرور اپنے بلہن کے دکھاوے کے مسرت آمیز بیجان میں شرارت سے پکارا۔ "تو نہیں بولتا... ہم تو تیرے بال ہیں بڑے کہتے تھے کہ تو نے ایک بار بلہن کو گھر والی کیا تھا.."

جواب میں اماں نے اپنی غصیلہ زبان میں اس کے ساتھ کچھ گال مند کیا لیکن اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا..

فہیم جو پچھلی رات کے جھکڑ میں برتنوں کے پچک کر ناکارہ ہو جانے کے رنج میں تھا 'یکدم کھل اٹھا۔ "ہاں جعفر یہ کیا قصہ ہے.. بلہن گھر والی کیسے ہو سکتی ہے.. ہیں؟"

"سائیں کے سامنے تو زبان نہیں کھلتی فہیم..." جعفر نے چھاتی کو شرمندگی سے کھجایا "اور بتانے کی بات بھی نہیں یونہی مشہور ہو گئی ہے.. جوانی میں بہت نادانی ہوتی ہے.. بندہ جنور ہو جاتا ہے پر میں نہیں ہوا.. یونہی قصہ بنا لیا ہے.."

ایک اور ڈولفن سندھ کے سینے کو چیر کر اوپر آئی اور پھر پانیوں کو پچھاڑتی ہوئی نیچے چلی گئی..

"سناؤ ناں اماں..." سرور نے اپنی دائیں آنکھ بند کر کے خاور کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگا..

"کبھی تو نہیں سنتی..." جعفر نے پیچھے مڑ کر تسلی کی اور پھر بولا "میں بہت چھوٹا تھا ابھی جوانی میں نکل رہا تھا جب میرے دادا کے جال میں ایک بلہن پھنس گئی.. مامن ماسا نے بتایا تھا کہ بلہن... ایک لڑکی کی طرح ہوتی ہے.. اس کے اعضا بھی ایک عورت والے ہوتے ہیں اور اگر تم اسے گھر والی سمجھ کر اس کے ساتھ میل کرو تو ساری زندگی تمہارا زور کم نہیں ہوتا.."

"بلہن کے ساتھ"

"ہاں سائیں.. پر میں جنور نہیں ہوا.. پر یہ قصے مشہور ہیں کہ ایسا ہوتا ہے اور اسی لئے ہمارے ہاں رواج ہے کہ اگر ایک بندہ بلہن کو پکڑ کر لے آتا ہے تو قبیلے والے اسے نہیں کھاتے.. ہاں اگر دو ہوں تب کھا لیتے ہیں کہ پاک ہوگی..."

"اماں اصل بھید نہیں کھولتے... چلو سائیں کو ہی کان میں بتا دو کہ کیا ہوا تھا.."

فہیم اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ "قصے یونہی تو مشہور نہیں ہو جاتے..."

"ہو جاتے ہیں..." جعفر کے چہرے پر ناراضگی ابھری..

"اسے بلہن کیوں بولتے ہیں؟"

"ادھر کی بولی میں بلہن کسی چھلانگ لگانے والی شے کو بولتے ہیں اور اگر کوئی موٹا اور بد ہیئت شخص ہو اسے بھی کہتے ہیں..."

فہیم اس کے پاس ہوا.. اپنی پر مسرت کیفیت کو رخصت کر کے نہایت سنجیدگی سے اپنی آواز مدہم کر کے اسے کہنے لگا۔ "سائیں برا نہ ماننا پر ایک بات پوچھ لوں... یہ درست ہے کہ سائیں برمانی نے ہدایت کی تھی کہ خاور صاحب جہاں تک جائیں لے جاؤ.. تم نے ان کا ساتھ دینا ہے جب تک یہ خود لوٹنے کو نہ کہیں.. پر سائیں آج سویرے بھی سرور اور جعفر نے مجھ سے بات کی تھی کہ بہت دن ہو گئے ہیں.. صاحب نے گھر کب جانا ہے.. تو سائیں کبھی نہ کبھی تو واپس جانا ہے تو کب جانا ہے.. آپ کا گھر تو ہو گا.. سب کا ہوتا ہے تو کب جانا ہے..."

وہ گئی رات... جب کہ بارہ کہو کے دیہات مکمل تاریکی میں سوتے تھے اور کہیں کہیں ایک آدھ بلب ٹمٹماتا تھا.. مری روڈ اجاز ہو چکی تھی اور سملی ڈیم کو جاتی سڑک پر

اپنے کنبہ میں اپنے سامنے پا کر حیران رہ گیا تھا "سامنے آپ کدھر؟"

"سندھ سامنے پر گھر بنانے آیا ہوں" اُس نے ہنس کر کہا تھا۔

فہیم اپنی نادانی میں یہ سمجھتا تھا کہ ہر شخص کا ایک گھر ہوتا ہے جہاں اسے بالآخر لوٹنا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کوئی ایک فرد ایسا بھی ہو سکتا ہے جس کے پاس لوٹنے کے لئے کوئی گھر نہیں ہوتا۔۔۔ البتہ لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی حیات کے قبضے میں جتنے بھی روز و شب رہ گئے تھے ان میں سلطانی کی قربت ممکن تھی۔۔۔ وہ گھر ہو سکتی تھی۔

"تو کب لوٹنا ہے سامنے؟"

"آج کہیں رات کر لیں گے فہیم۔۔۔ توکل سویرے ہم واپس ہو جائیں گے۔"

بہت دیر سے کوئی ذوالفن سینہ آب پر نہیں ابھری تھی۔۔۔ وہ بقول سرور پانیوں کے اندر گھر بنائے کھڑی تھیں اور لوٹ چکی تھیں۔

دیرانی اور اکلا پے کے سوا کچھ نہ تھا۔۔۔ وہ سفید کاغذوں پر جھکا۔۔۔ جو ٹیبل لیپ کی تیز روشنی میں کچھ زیادہ سفید ہوتے تھے اپنے ذہن پر بوجھ ڈالتا تھا۔۔۔ ان پر اتارنے کے لئے لفظوں کا چناؤ کرتا تھا جب اس ٹھہرے ہوئے سکوت بھرے سنانے میں اس کے عین سامنے جو بک شیلٹ تھا اس کے اندر ایک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور بغیر کسی انتباہ کے بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اپنے دانت کھولے دیوار کو ڈھاتے ہوئے اس کی کتابوں، تصویروں اور مجسموں کو مسمار کرتے اس کی کرسی تک آگئے تھے۔۔۔ اس نے بمشکل اپنے آپ کو بلے میں دفن ہونے سے بچایا تھا۔

اُس تک آنے سے پیشتر وہ اس کے بیڈ روم اور ڈرائنگ روم میں دندناتے انہیں مایا میٹ کر چکے تھے۔

صبح ہوئی تو وہ ایک کھنڈر کے درمیان میں تھا۔

اُس کا گھر کسی حد تک غیر قانونی تو تھا کہ اس کا نقشہ پاس نہیں ہوا تھا لیکن اس پاس سینکڑوں گھر اسی طور وجود میں آئے تھے۔ اور وہ سب کے سب نہیں گرائے گئے تھے۔ بل ڈوزر کے آہنی بلیڈ اندھے نہیں تھے، تخصیص کر سکتے تھے۔ وہ دیکھ سکتے تھے کہ کون حیثیت والا ہے۔۔۔ کسے صرف چھوٹا ہے صرف چار دیواری کو گرانا ہے۔ اور کسے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینی ہیں اور کسے کھنڈر کر دینا ہے۔ جن کے لئے آنکھیں کھلی رکھی گئیں وہ اقتدار کے ایوانوں تک رسائی رکھتے تھے۔ جرم کی دنیا میں اہمیت رکھتے تھے۔ کچھ سیاست دان تھے اور کچھ سائنس دان اور کچھ فوجی۔ لیکن اس کی خاور کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ ایک کاغذ کا لے کرنے والے شخص کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اس کی وقعت اور تعظیم کیا ہو سکتی تھی۔

بہت سے دوسرے تھے جو آہ و بکا کرتے تھے۔ ان کے بچے سہمے ہوئے تھے اور زندگی کے نکل آثار بلے میں دبے پڑے تھے۔ وہ درخواستیں تیار کر رہے تھے۔ حکومت کے ایوانوں میں جوہت تھے ان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے۔ احتجاج کرنے کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ لیکن اس نے روشنی ہوتے ہی بلے میں سے چند کتابیں نکالیں جو اوندھی پڑی تھیں وارڈروب ابھی سلامت تھی اس میں سے چند کپڑے کھینچ کر نکالے اور انہیں ایک بیگ میں ٹھونس کر اس کھنڈر میں سے نکل گیا۔ برمانی اُسے یکدم چوٹی زریں میں

انہیں رہائی کی نوید مل چکی تھی اس لئے وہ مسرت سے لبریز ہو رہے تھے۔
خاور کے آئندہ دنوں میں ایک کھنڈر تھا اور واپسی کا خوف ایک تیندوے کی طرح
اس کی ایک ایک رگ سے لپٹ کر اس کا سانس روکتا تھا۔ اُس نے کہاں واپس جانا تھا۔

کراچی سے واپسی پر وہ بہت دن ایک بے یقین کیفیت میں بے حس رہا۔ جیسے
مصنوعی مانگوں والا ایک شخص اپنے نچلے دھڑ میں کچھ بھی محسوس نہیں کرتا۔
یہ محبت میں ہزیمت نہیں تھی۔ یہ نہیں کہ وہ عابدہ سومرو کے عشق کے
زیر آب جال میں ایک اندھی ڈولفن کی طرح بھنس گیا تھا۔ وہ تو اس کی موت کے خدشے
کے چنگل میں الجھ کر اس کے قریب ہوا تھا۔ وہ اس کے لئے رویا تھا۔ اس کی خیر خواتی آواز
اور قربت مرگ اس کے دل میں چھید ڈالتی تھی۔ کھڑکی کی چوکھٹ پر انکا سورج کا سُرخ
وجود ان دونوں کو جنس اور محبت کے ملاپ میں یک جان ہوتے نہیں بلکہ متوقع موت کی
آخری رسوم میں الجھے ہوئے دیکھتا تھا۔ اور پھر یکدم شہلا آفریدی نے اسے برہنہ کر دیا۔ اس
کے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ ایک عارضی پڑاؤ پر ایک شب گزار کر وہ
آگے چلی گئی تھی۔

بہت دنوں سے غلامی آنکھوں کا فون بھی نہیں آیا تھا۔ لاہور سے کراچی تک
کے سفر میں جہاز میں جو قعود ہوا تھا اس کے بعد وہ احتیاط کرنے لگا تھا۔ اس کے فون کا جواب
نہ دیتا تھا۔ وہ ”ہیلو“ کہنے کے بعد منتیں کرنے لگتی تھی کہ اب ایسا نہیں ہو گا لیکن اس کا کچھ
اعتبار نہ تھا۔ وہ خود اپنے آپ کو پاگل خانہ کہتی تھی تو ایک پاگل خانہ کا کیا اعتبار اور پھر وہ بے سنج گیا
تھا۔ باقاعدگی سے تو نہیں کبھی کبھار اُس سے مل لیتا تھا لیکن اب بہت دنوں سے اُس کا فون
نہیں آیا تھا۔ اور اب اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا فون آجائے اور وہ اپنے زیرِ پوائنٹ پر
کھڑے ہو کر... چکن ٹو مینو سینڈوچ چباتے ہوئے۔ بارہ کھو کے دیہات میں اولین بلب
روشن ہوتے ہوئے۔ دیکھتے۔ مخروط دم والے کرلے کو ریگتے۔ دیکھتے۔ اسے عابدہ سومرو کی
اصلیت کے بارے میں بتائے۔ اسے اپنی شرمندگی میں حصہ دار بنائے۔

خاور اس کے ردِ عمل کو جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے عابدہ کے نفسیاتی بہاؤ اور
اس سے لا تعلق موت کی قربت۔ عدم اور نیستی کی داستانوں کے بے بنیاد ہونے پر نہایت

رات کی اجازت اور بے آباد سیاہی میں الاؤ کی ٹہنیوں کے چلنے سے ان کے سلگنے،
ٹوٹنے اور کوئلہ بن کر رکھ ہونے کی آوازیں اور سر سر اہٹ جنم لیتی تھیں۔ جیسے کائنات کا
سکوت ہولے ہولے ٹوٹتا ہو۔ اُس میں دراڑیں پڑتی ہوں۔ اور ان تینوں کے پرچھائیاں الاؤ
سے دور سر کندوں پر بے حساب ہوتی تھیں، لا تعداد متحرک جہوم ہوتی تھیں جیسے وہاں ایک
اور دنیا ہو۔ ان کے بیٹے ہوئے جتنے جنم تھے ان کے سائے رقص کرتے ہوں۔ ہزاروں
برسوں کی تنہائی اور گمشدگی سے تنگ آئے ہوئے جنم آج کی شب ظاہر ہو گئے ہوں۔ لیکن
ان کے قریب نہ آتے ہوں ذرا فاصلے پر رہتے سروٹوں پر حرکت کرتے سائے ڈالتے جھومر
ناچتے ہوں۔

اُن کی سرخوشی اور بے حجاب مسرت کا سبب صرف بُئی کے گھونٹ نہ تھے۔ وہ
کل سویرے اس بے جواز مسافت کو ترک کر کے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ غازی
گھاٹ کے ساحل کو واپس جا رہے تھے۔ فہیم اپنے نور پور جا رہا تھا۔ کچھلی چندراتوں میں ان
کے جو پڑاؤ تھے ان کے جوڈیرے تھے ان میں پہلے پہل کی رونقیں نہیں تھیں، خاموشی اور
نظہری ہوئی اداسی اتر چکی تھی۔ وہ صاحب کے لئے اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس کی
چاکری کرتے تھے۔ کشتی کہتے تھے، کھانا بنا کر خیمے لگاتے تھے اور ایک وہم کے ساتھ سو جاتے
تھے۔ انہیں وہم تھا کہ یہ سائیں کوئی بلا ہے۔ بھوت پریت کا سنگی ساتھی ہے جو ہمیں اپنے
ساتھ گھسیٹتا ہوا جانے کہاں لے جا رہا ہے۔ جانے ہم لوٹتے بھی ہیں یا نہیں۔ نہ یہ پرندوں کا
شکاری ہے۔ نہ دارو کا شوقین ہے اور نہ اس نے کبھی پر نظر کی ہے۔ چنانچہ یہ صرف ساوی
کے گھونٹ نہ تھے۔ وہ اپنی رہائی پر خوش تھے۔

وہ آج تک کناروں پر ہی قیام کرتے تھے۔ جس نا پور پر رات بسر کرنے کا فیصلہ
ہوتا اس کے کنارے کشتی باندھتے اور اسی کے قریب چولہے جلاتے۔ خیمے نصب کرتے اور
الاؤ روشن کرتے لیکن آج وہ کشتی کو چھوڑ کر ادھر گھنے ذخیرے کے اندر رات کرنے کے
لئے آگئے تھے۔

”سائیں کناروں پر تو ہمیشہ منظر کشی کرتے ہیں۔“ فہیم نے اس سے اجازت مانگی
تھی۔ ”آج آخری بار الاؤ جلاؤں گے تو ذرا ادھر سروٹوں کے اندر چل کر رات کرتے ہیں“
منظر کشی ادھر کرتے ہیں۔ ہوا بھی کم ہوگی اور منظر بھی عجب ہوگا۔“

خوش ہونا تھا.. اپنی غلامی آنکھوں کو جھپکتے ہوئے مسلسل رونا تھا اور خوش ہونا تھا.. اور اس کے باوجود وہ اسے اپنی شرمندگی کا حصہ دار بنانا چاہتا تھا..

ٹیلی فون نمبر اس کے پاس موجود تھا کیونکہ ایک روز جانے کس کیفیت میں اس نے کہا تھا کہ.. تمہارے پاس میرا نمبر تو ہونا چاہئے.. لیکن آج تک وہ اس کی انگلیوں سے ڈائل نہیں ہوا تھا اس لئے کہ وہ اس کی پرائیویسی کا احترام کرتا تھا.. یہ طے تھا کہ صرف وہی اسے ٹیلی فون کرے گی..

لیکن بہت دنوں سے.. اتنے دن کبھی نہیں گزرے تھے.. اس کا فون نہیں آیا تھا.. بل ڈوزر کے بلیڈ کی آمد سے پہلے جب اس کے آس پاس دیواریں تھیں اور سر پر چھت تھی اور ایک گھر تھا.. خاور نے آخری فون اسے کیا تھا..

”جی ہیلو..“ کسی مرد کی روکھی اور بے روح آواز تھی.. وہ جھجک گیا.. جواب میں کیا کہے... کہتے کہتے رک گیا اور فون بند کر دیا.. وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا تو وہ کیا کہے کہ کس سے بات کرنی ہے..

تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر ڈائل کیا..

”جی ہیلو..“

”آپ.. کون بول رہے ہیں؟“

”آپ نے کس سے بات کرنی ہے..“ لہجے میں تھکاوٹ اور بیزاری تھی.. شاید

اس کا بیٹا تھا..

”آپ کی والدہ اگر گھر پر ہیں تو...“

”آپ کون بول رہے ہیں؟“

”جی میرا نام خاور ہے اور... میں ان کو جانتا ہوں.. آپ.. آپ ان کے بیٹے بول

رہے ہیں؟“

”جی...“ لہجے میں شناسائی آگئی.. ”جی.. میں آپ کو جانتا ہوں سر.. آپ سے مل

چکا ہوں ایئر پورٹ پر.. جب اماں کراچی جا رہی تھیں اور میں نے آپ سے ریکورسٹ کی تھی

کہ آپ ان کے برابر میں بیٹھ جائیں.. میں سر آپ کو جانتا ہوں..“

”تھینک یو.. تو ان سے بات ہو سکتی ہے؟“

”وہ.. اماں تو.. جھپٹے ہفتے ان کا انتقال ہو گیا ہے..“

”جی...“

اس فون پر اس تک آنے والی آواز مخدوش لگتی تھی.. یہ غلط نمبر تھا..

”آپ نہیں جانتے؟“

”نہیں...“

”یہ سب کچھ اچانک تھا.. وہ اکثر آپ کا تذکرہ کرتی تھیں ایک فکسیشن تھی آپ

کے لئے.. اور اب بہت خوش ہوتے تھے انہیں چھیڑتے تھے اور وہ سرخ ہو جاتی تھیں.. جی

سر... آپ نہیں جانتے مگر شی وازاے گریٹ فین آف یورس.. ان کا سوال ہے پرسوں..

آپ اگر آسکتے ہیں تو... شی دل بی ویری پی..“

اس کا ذہن منجمد ہو گیا.. جیسے ہزاروں برسوں کی برف انٹارکٹک میں بے حس اور

سرد ہوتی ہے اور اس کے نیچے کئی کلو میٹر کی گہرائی میں کوئی ایک جھیل پوشیدہ ہوتی ہے جو

اپنے بھید عیاں نہیں کر سکتی.. ”آئی ایم سوری بیٹے.. یہ کیسے ہوا؟“

”ہمیں ان سے بہت شکایت ہے...“ نوجوان جسے اپنے حواس اور آواز پر ابھی

تک مکمل اختیار تھا، ہچکیاں لینے لگا.. ”انہیں معلوم تھا لیکن انہوں نے ہمیں بتایا نہیں..

چھپائے رکھا.. ایک پیچیدہ قسم کا کینسر تھا اور اس کی تشخیص ہونے پر انہوں نے ہمیں بتایا

نہیں... وہ... ہمیشہ اپنے ہینڈ بیگ میں سے گولیاں اور کیپسول نکال کر پھاٹکتی رہتی تھیں اور

کہتی تھیں کہ یہ وٹامن ہیں... اور پھر... دو تین روز کے اندر اندر.. آپ کسی وقت ہمارے

ہاں آئیں انکل.. اماں کی وجہ سے ہم بھی آپ کو اپنا اپنا محسوس کرتے ہیں.. ابھی لوگ آ

رہے ہیں..“

نہ اسے کبھی اس کے وجود کا یقین آیا تھا اور نہ ہی اب اس کے عدم وجود سے

مفاہمت ہو رہی تھی.. یہ دونوں وہم کے پرندے تھے جو اس کی ذات کے گھونسلے میں اترے

تھے..

اس کے ہونے کا کوئی نشان باقی نہ رہا تھا..

اسے بارہ کہو کی پہاڑیوں میں جا کر اس بڑے پتھر کی کوکھ میں جھانکنا چاہئے.. یہ

دیکھنے کے لئے کہ کیا وہاں واقعی خورد و نوش کی کچھ چیزیں ہیں جو شاید وہ آخری بار وہاں رکھ کر

گئی ہو... اپنے ہونے کے نشان کے طور پر...
بس یہی توجہ تھی اس کے مختلف اجزاء سے بنے ہوئے کردار کی.. اس کی
شخصیت کے الجھاؤ کی.. تشخیص کے بعد ہی اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ اس مہلت کے اندر
اندر جو اسے ملی تھی وہ کچھ کر گزرے جو اس کا جی چاہتا تھا..

تبھی وہ روتی بہت تھی..

اپنی موت کے لئے خود ہی پیشگی روتی رہتی تھی..

غلامی آنکھوں میں اسی لئے آنسو بہت تھے..

موت کے ذراے میں نیلے دھبوں کے بدن کے ساتھ وہ... عابدہ سومرو
اداکاری کرتی تھی.. اگرچہ ان لمحوں میں جب وہ سٹیج پر ہوتی تھی 'اپنے کردار میں ڈوب کر
حقیقت ہو جاتی تھی.. اور وہ جسے مرگ کی سٹیج پر دھکیل دیا گیا تھا 'ظاہر نہ کرتی تھی.. صرف
آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ ایک بڑی اداکارہ ہے.. اسے بہترین
اداکاری کا کوئی بھی ایوارڈ نہیں مل سکتا تھا..

وہ اس کا نام بھی نہیں جانتا تھا..

لاسٹ ٹینکوان پیرس کی طرح... میں تو اس شخص کا نام بھی نہیں کا نتی...

کل کلاں کسی بھی قبرستان میں کسی کتبے کو پڑھ کر وہ یہی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ..

یہاں دفن ہے...

ملا حاحا... حاحا...

ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار و نجباں

پکھنی کا دراوڑی بدن... رات کے سیاہ اکھا پے میں.. کہ الاؤ کی طرف کسی نے
دھیان نہیں کیا تھا اور وہ راکھ میں بدل چکا تھا.. تو پکھنی کا دراوڑی بدن گھنے سروٹوں پر اپنے
سائے بھیجتا تھا 'اپنے پچھلے جنم کو لوٹا تھا 'بے خود' بے راہرو اور آزاد ہوتا تھا.. اس کے
کولہوں پر ابھی تک ریت کے ذرے چمٹے ہوئے تھے... اور اس کی چھاتیوں میں مونہ جو فلدو
کے پریسٹ کنگ کا تختہ الٹ دینے کی صلاحیت تھی...

فہیم بازو بلند کئے... سرور کی پرات کی تال پر حرکت کرتا ہوا... اماں جعفر جھکا ہوا

بوٹی کی مٹک میں رچا ہوا اور ان دونوں کے درمیان پکھنی اپنے پچھلے جنم میں رات کی سیاہی کو
اپنی سیاہ تر آنکھوں سے چیرتی.. ان دونوں کی موجودگی سے لا پرواہ اپنے آپ میں گم ناچتی
تھی..

الاؤ کے گرد جو ہانڈیاں اور برتن خوراک کے دھرے تھے.. اس آس میں پڑے
تھے کہ گرم رہیں گے وہ اب ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ان پر راکھ کی تہہ جمی جاتی تھی..

خاور کو بھی بھوک نہ تھی..

اگرچہ اس نے فہیم سے خصوصی فرمائش کر کے سنگھاڑا مچھلی کا سالن بنوایا تھا
حلوے کی خواہش کی تھی لیکن اس کی اشتہا خست ہو چکی تھی..

وہ تینوں اس کے وجود سے بھی غافل ہو چکے تھے.. وہ ان کے لئے فالتو ہو چکا تھا
کیونکہ کوچ کا نقارہ بج چکا تھا وہ اگلی صبح گھروں کو لوٹ رہے تھے اس لئے اس کی ضرورت باقی
نہیں رہی تھی..

ریت کی گرفت میں سے خاور نے اپنے آپ کو ذرا دور لگا کر اٹھایا.. کچھ دیر انہیں
دیکھتا رہا.. یہی وہ لمحے تھے اس بیابان میں.. اس سروٹوں سے گھر سے جزیرے میں جو ان
تینوں کو اس سے ممتاز کرتے تھے.. وہ برتر ہوتے تھے اور وہ حقیر ہوتا تھا کہ وہ اپنے تہذیبی
پس منظر میں اسیران کی روح میں شامل نہیں ہو سکتا تھا اور وہ تینوں قیود میں نہ تھے آزاد
تھے..

خاور نے ابھی تک پکھنی کے کولہوں سے چمٹی ریت کو دیکھا اور پھر اپنی پشت کو
جھاڑ کر ان سے پرے ہو کر سروٹوں اور سرکنڈوں کی جانب چلنے لگا..

انہوں نے ذرا دم لے کر اس سے نہیں پوچھا کہ سائیں کدھر جاتے ہو.. کہ وہ اس
سے غافل ہو چکے تھے.. ہاں پکھنی کے کولہوں نے اور چھاتیوں نے اس پر ایک نظر کی اور پھر
سے اپنے پچھلے جنم میں چلے گئے..

سروٹوں پر ان تینوں کے سایوں کا کھیل حرکت کرتا تھا..

وہ ان کی پرچھائیوں سے ان تینوں کو الگ الگ پہچان سکتا تھا..

جو سایہ سرکنڈوں سے بھی اوپر نکلتا تھا وہ فہیم تھا.. جھکا ہوا.. کچھ تلاش کرتا سایہ
جعفر کا تھا اور ان کے بیچ پکھنی کی پرچھائیاں سرور کی تال کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں..

پر چھائیوں کے اس کھیل کے اندر خاور نے قدم رکھا تو سروٹ شروع ہو گئے۔ ان کی شاخیں تیکھی اور تیز دھار کی تھیں۔ وہ اندھیرے میں ان میں راہ بناتا، اپنے ہاتھ پھیلائے ان میں سے راہ بناتا آگے ہوتا تھا تو اس کے گالوں اور ہاتھوں پر ان کی دھاریں وار کرتی تھی اور خراشوں میں سے خون پھوٹتا تھا۔

سروٹوں سے نکل کر ریتلے کنارے کم اندھیرے میں تھے اور کشتی نظر آرہی تھی متعدد کھونٹوں سے بندھی رسوں میں جکڑی کشتی اتنی مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی کہ پانیوں میں کسمسا بھی نہیں سکتی تھی۔ نہ یہاں سروٹ کی پرات کی تھاپ سنائی دیتی تھی اور نہ یہ شک ہوتا تھا کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ذخیرے کے اندر تین وجود جھومر ڈال رہے ہیں کیونکہ انہیں رہائی کی خبر مل چکی ہے۔ کشتی سے ذرا فاصلے پر ریت کا ایک ابھار تھا۔

رات میں وہ پوری طرح عیاں تو نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا ابھار ایک گمان کی صورت میں اس کا پتا دیتا تھا اور جب وہ کنارے کی ریت پر چلتا ہوا اس تک پہنچا تھا تو قدم بتاتے تھے کہ اب وہ اوپر اٹھ رہے ہیں۔

آلتی پالتی مارے ہوئے وہاں بیٹھا بہت دیر تک وہ ایک تاریک خلا میں رہا۔ ایک ریت پر رہ جانے والے ڈولفن کی مانند ناپید رہا۔ اور یہاں سے۔ اگر ایک شخص بہت دیر تک آنکھیں جھپکاتا رہے تو اسے احساس ہوتا تھا کہ کشتی کے پہلو میں سے نکلتی ایک سیاہ چادر ہے جو دھیرے دھیرے بدلتی ہے۔ ہولے ہولے بہتی ہے۔

سندھ ساگر اس کے لئے۔ ایک عارضی پڑاؤ تھا جہاں سے اس نے کل سویرے کوچ کر جانا تھا۔ لیکن کہاں جانا تھا۔ اس کے بارے میں مکمل ناپیدائی تھی۔ عابدہ سومرو جانتی تھی کہ ایک عارضی پڑاؤ کے بعد کہاں جاتے ہیں۔ غلامی آنکھوں کو بھی خبر مل چکی تھی کہ اس نے کہاں جانا ہے۔ ان دونوں نے اسے ایک عارضی پڑاؤ کے طور پر استعمال کیا تھا اور چلی گئی تھیں۔ سلطانہ اگرچہ تھی لیکن وہ اسے ناظم الدین روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا چلے جانے کی خواہش کا اظہار کرنے کے باوجود سب کچھ فراموش کر کے لا تعلق ہو سکتی تھی۔ سری لنکا سے واپسی پر ایئر پورٹ پر اسے پہچانے بغیر آگے جاسکتی تھی۔ جیسے لا تعلق سے ایک عارضی پڑاؤ کو چھوڑ کر آگے جایا جاتا ہے۔

ہوا پہلو بدلتی ہوئی آئی تو سروٹوں کی جانب سے سروٹ کی پرات کی تال لمحے بھر

کے لئے تیرتی ہوئی اس کی قربت میں آنکلی اور پھر سناٹے نے اسے نکل کر اجل میں دھکیل دیا۔

کل سویرے اُسے کہاں واپس جانا تھا؟۔
آنکھیں جھپکاتا خاور سامنے دیکھتا رہا۔ ریت ٹھنڈی ہو رہی تھی۔
سامنے سندھ اندھیرے کی اجرک میں لپٹا کر وٹیں لے رہا تھا۔
اور وہاں روشنی تھی۔

کائنات کے آغاز میں یہی کروٹیں بدلتے اندھیرے تھے اور ان پر پانیوں کی روح تیرتی تھی جب اذن ہوا کہ روشنی ہو جا۔ اور وہاں روشنی تھی۔
وہی چادر جو ابھی تاریکیوں میں پوشیدہ تھی ابھی اس پر روشنی پھینے لگی۔ وہ جگمگانے لگی۔ اس پر ستارے اترنے لگے۔ دائیں جانب سے انڈس کوئین ایک منجھلی ہوئی اداکارہ کی طرح۔ جو ہر شب ایک خاص وقت پر سٹیج پر داخل ہوتی ہے۔ وہ نمودار ہو رہی تھی۔

عرشے پر رسوں سے بندھے بلب جھولتے تھے۔
اس پر ایک دنیا آباد تھی۔

مسافر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

ان کے چہرے اور ان کے لہادے پہچانے نہ جاتے تھے کہ وہ گئے وقتوں کے تھے۔

راج کے رکھوالے سفید فام۔۔ گورالوگ اور ان کے غلاموں کی آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والی شاہانہ دروایاں۔۔ پرچہ موم سے اکڑی مونچھیں جو ہر صاحب یا میم صاحب کو دیکھتے ہی پکھل کر ڈھیلی ہوتی گر جاتی تھیں اور وہ انہی کے تناسب سے صاحب بہادر کے سامنے گرتے اور جھکتے چلے جاتے تھے۔

کوئی سولا ہیٹ اور خاکی وردی میں ملبوس بظاہر آوارہ گرد سیاح جو بلوچ و حشیوں کی سرزمین کو پہلی بار دریافت کرنے کے لئے آیا تھا اور اپنے سفر کے نقشے اس اہتمام سے بناتا تھا کہ برطانوی راج کو بہ وقت ضرورت تہذیب پھیلانے کے لئے مددگار ثابت ہوں۔ اور سرکشی اختیار کرنے والے بلوچوں کو مطیع کرنا آسان ہو۔

ایک سفید روسی پوڈل.. کیوٹ اینڈ کڈلی... حیران اور پریشان.. اپنی سفید فام مالکن سے بچھڑا ہوا.. بھوم سے ہراساں.. عرشے کے ایک کھمبے کے قریب ہو کر ٹانگ اٹھائے اپنے آپ کو ہلکا کرنے میں مصروف.. اور متعدد معززین اسے دیکھ کر لاڈ سے مسکراتے ہوئے اپنی اچکنوں کی بالائی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اور ان میں سے ریشمی رومالوں کو کھینچ نکالنے کی آرزو میں.. تاکہ خوشنودی کے لئے ان سے عرشے کو پونچھا جا سکے..

لیکن ان سب سے الگ تھلگ..

عرشے کی ریٹنگ پر دونوں ہاتھ جمائے.. اپنے سامنے تاریکی میں گھورتی.. اس ٹیلے کی جانب بے نور آنکھوں سے تنقیدی.. کچھ شکلیں تھیں.. وہ ہر لمحہ بدلتی تھیں.. تغیر سے دوچار ہوتی تھیں.. کبھی وہ عابدہ سومرو تھیں جو اسے پہچانتی نہ تھی.. اور کبھی غلامی آنکھیں تھیں جو خاک ہوتی تھیں.. انڈس کوئین.. اس کے سامنے ایک رواں منظر کی طرح.. سندھ سائیں کے تاریک سینے پر روشنیاں بکھیرتی، تیرتی، گزرتی جاتی تھی.. اور پھر اس گزرنے میں کوئی ایک لمحہ ایسے رکا کہ وہ ٹھہر گئی.. وہیں ایک ہی مقام پر ساکت اور سناٹے میں آکر جہاں تھی وہیں ٹھہر گئی..

اس کے عرشے پر جو رونق تھی وہ اس کے ٹھہرنے سے ماند نہ ہوئی.. جاری رہی.. کسی کو بھی احساس نہ ہوا کہ وہ سکوت میں چلی گئی ہے.. روانی ختم گئی ہے..

جیسے اس نے اپنے بھاری لنگر گرا دیے ہوں..

خاور کے سامنے سندھ کی سیاہی میں اس کی روشنیاں ایک ہی مقام پر جگمگاتی رہیں.. رونق میں فرق نہ آیا..

خاور تادیر اس کی پھر سے روانی کا منتظر رہا.. ایک مثل لائف پینٹنگ کی مانند اسے دیکھتا رہا جس میں جان نہیں ہوتی..

ذخیرے کے اندر کبھی اپنے پچھلے جنم کو لوٹ کر سروٹوں پر پرچھائیں ہوتی تھی..

وہ صدیوں سے اس ٹیلے پر براجمان اسے دیکھتا رہا اور انڈس کوئین وہیں کھڑی رہی.. اور پھر بغیر کسی اطلاع کے... کسی تشخیص کے بغیر اس کا رکا ہوا وجود نہایت دھیرج سے پانیوں

میں ڈوبنے لگا.. بے جواز... بغیر کسی وجہ کے... کسی بر فانی تودے سے ٹکرانے کے بغیر.. وہ آہستہ آہستہ نیچے جانے لگا.. ڈوبنے لگا..

لیکن عرشے پر کھڑے اور ٹپکتے ہوئے لوگوں کے چہروں پر کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہ ہوئی.. وہ جیسے آگاہ ہی نہیں تھے کہ انڈس کوئین اتنی دیر تک اگر ایک ہی مقام پر رکی رہی ہے تو کیوں.. اور اگر اب آہستگی سے ایک بھاری پتھر کی طرح نیچے جا رہی ہے تو کیوں... وہ مشغول تھے اور آگاہ ہی نہیں تھے..

وہ سب اسی طور اپنی اپنی حالتوں اور کیفیتوں میں برقرار رہے اور انڈس کوئین کے عرشے تک پانی آگئے.. اوپر ہوتے گئے.. ان کے لمبے کوٹ پانی کے ابھرنے سے اٹھتے.. ان کی نیک ناز تک پانی آتا تو وہ سطح آب پر چیتھڑوں کی طرح تیرنے لگتیں...

بڑے گھیرے والی بلوچ شلواریں پانی سے بھر کر پھولنے لگیں.. سرداروں کی مونچھوں کے بل کھلنے لگے.. بھاری پکڑیوں پر پانی کی روانی غالب آنے لگی لیکن اس کے باوجود انہیں احساس نہ ہوا کہ ہم ڈوب رہے ہیں..

سفید روسی پوڈل کب کا غائب ہو چکا تھا اس لئے کہ عرشے پر سندھ سائیں کی چادر بننے لگی تھی..

یہاں تک کہ کموڈ پر اطمینان سے براجمان پھولدار بڑے ہیٹ اور گھنٹوں تک آتے پوکاڈوٹ ڈریس میں ملبوس معزز لیڈی صاحبہ کو بھی فراغت کے ان لمحوں میں کچھ علم نہ ہوا کہ پانی ایک بے نام آہستگی سے کموڈ کوڈ بو کر اس کے چینی پر لڑکے ہار تک پہنچ چکے ہیں.. وہ اسی اطمینان سے بیٹھی رہی جیسے ایک تصویر اترواتی ہو..

وہ سب... جو انڈس کوئین کے مسافر تھے.. پانی پر اٹھتے ایک بلبلے ایسی بے آواز کیفیت میں انڈس کوئین کے ساتھ نیچے ہوتے گئے..

سندھ کے تاریک پانیوں کے اوپر انڈس کوئین کی تدفین کا آخری نشان وہ بھونپو تھا جو ایک کھوکھلے ستون کی مانند سطح آب میں سے نکلا ہوا دکھائی دیا.. کچھ دیر اس کی آنکھوں کے سامنے رہا اور پھر وہ بھی پانیوں میں چلا گیا..

سندھ سائیں کی چادر پھر سے اپنی آبائی تاریکی میں چلی گئی..

وہ جس مقام پر رکی تھی.. انڈس کوئین جہاں پانیوں میں آہستگی سے تحلیل ہوئی

تھی.. وہاں اس کے وجود کے کوئی آثار باقی نہ تھے.. جیسے ایک ڈولفن.. دھیرے سے نیچے چلی گئی ہو.. نہ سطح آب پر کوئی تلاطم ہو.. نہ بلبلے ابھرتے ہوں... پانیوں کی وہی تاریک ہمواری اور روانی ہو جو اس کے منظر میں جگمگاتے ہوئے داخل ہونے سے پہلے تھی..

اور اس لمحے... گھنٹی گھاس اور سرکنڈوں کے ذخیرے کے اندر سے.. جہاں فہیم جھومر ڈالتا تھا.. کبھی کا اور اوڑی بدن سردیوں پر اپنی پر چھائیاں ڈالتا پچھلے جنموں کو لوٹتا تھا اور ماماں جعفر کے اندر بوٹی مشک مچاتی تھی وہاں.. ایک مور بولا... مہی آؤں... مہی آؤں...

”موت... مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے.. ڈیجھ!“

کسی بھی موت کا ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے.. عمر رسیدہ... کچی... ناگہانی... حادثاتی... بے وجہ... کسی بھی موت کا.. زمین کی پہلی موت پر جب کوئے اترے تھے چوچ سے مٹی کھود کر تدفین کی بھارت سلجھاتے تھے.. تب سے اب تک لمحہ موجود کی آخری موت تک... وہی ایک مخصوص طے شدہ ماحول ہوتا ہے..

بُو ہوتی ہے...

اور بُو کے سوا بہن ہوتے ہیں...

اور بُو بتاتی ہے کہ چارپائی پر سفید چادر کے نیچے جو شخص ہے اس نے آخری ہنگی کب لی تھی.. اور اس کے تلوؤں سے فنا کی جو ٹھنڈک شروع ہوئی تھی وہ اس کے بدن کو مردہ کرتی کب اس کی آنکھوں تک پہنچی تھی اور انہیں بے جان ڈھلکا ہوا شیشہ کر دیا تھا..

عمر رسیدہ موت متوقع ہوتی ہے اور اس کا رد عمل میکا کی ہوتا ہے..

کچی موت میں ہمدردی بہت ہوتی ہے اس تشکر کے ساتھ کہ وہ ان کے گھر نہیں آگئی..

یقین سے ماورا ہو جانے والی موت حادثاتی ہوتی ہے..

اور بے وجہ موت کی کوئی وجہ نہیں ہوتی..

لیکن ہر مقام پر چار دیواری کے اندر اس کی بُو ضرور موجود ہوتی ہے..

وہ شخص جو سفید چادر تلے عامل معمول ایسے کھیل کی طرح لیٹا ہوتا ہے وہ دم بخود ہوتا ہے اور یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے یا نہیں.. صرف بُو بتاتی ہے..

اس چادر کا ایک کونہ اٹھا کر اسے دیکھا جائے تو اس کا چہرہ زرد پھلکڑی ہو گا.. اور

اس پر ایک عجیب حماقت آمیز تاثر ہو گا 'منہ کھلا ہوا.. رگیں ڈھیلی اور ٹھنڈی ہو چکی ہوئیں

اور کھلے منہ کے اندر تالو اور مسوڑھے زردی کی کھنڈت میں..

صرف دو مواقع پر انسان اپنے اختیار سے باہر ہو کر بے بس ہو جاتا ہے اور حماقت کے قریب چلا جاتا ہے.. ایک نسل بڑھانے کے آخری لمحوں میں یا پھر موت کے بعد..

موت بھی چونکہ اختیار سے باہر ہوتی ہے اس لئے اس میں بے اختیار ہوتی ہے.. اگر یہ کھلی فضاؤں میں آئے.. کسی بر فانی در اڑ میں گر کر.. مرنے کے بعد رسوائی کے ڈر سے غرق دریا ہو کر آئے.. صحرا میں پیاس سے بدن خشک ہو جائے.. یا پھر پانیوں کی چادر میں ڈولتی ایک کشتی کے اندر آ جائے تو بھی وہاں بُو ہوتی ہے.. لیکن وہاں اس کا خشک نہیں ہوتا.. کہ یہ اکیلی نہیں ہوتی.. یہ پانیوں کے دھیرے دھیرے خشک ہونے کی.. بستیوں کے برباد ہونے کی.. ان پرندوں کی جو شکاریوں کے چھروں سے زخمی ہو کر پانیوں اور ٹاپوؤں پر گر کر پھڑپھڑاتے رہے اور پھر جان ہار گئے ان کے مردہ پروں اور سڑتے گوشت کی.. مردہ مچھلیوں اور ٹھہرے ہوئے پانیوں کی بُو بھی ہو سکتی ہے.. اسی لئے صرف مرگ کی مہک ان سے الگ پہچانی نہیں جاسکتی.. اگرچہ وہ وہاں ہوتی ہے..

فہیم سروٹوں، سرکنڈوں، کاہاں، سر، کوندے، لائی اور لہنا کے بوٹوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتا.. اور سروٹوں پر اب پچھلے جنم کے سائے جھومر نہ ڈالتے تھے.. اب وہاں سویر کی دھند میں گھٹی ہلکی دھوپ تھی.. وہ ملاھا.. حا.. ہالی نہ بیڑی ٹھیل ساڈھے یار ونبھاں.. گنگنا تا.. آخری ناشتے، آخری پرائے اور غروب کی زردی والے دیسی انڈوں کی زردی سنبھالتا اترتا ہے.. سروٹوں کے گھنے وجود میں سے نکل کر ریتلے کنارے پر اترتا ہے.. اور ریت پر اس کی ٹھنڈک اور جماؤ ہے جس پر پاؤں رکھتا وہ سندھ سائیں کے پانیوں میں ٹھہرتی کشتی کی جانب چلتا جاتا ہے.. اور اپنے گھر واپسی کی مسرت میں دمکتا گنگنا تا آتا ہے اور آج پانی کی قید کا آخری دن تھا.. آخری ناشتہ تھا..

صاحب رات کشتی میں ہی رہ گیا تھا..

ان سے جدا ہو کر ادھر آیا تھا اور ادھر ہی رہ گیا تھا..

سویرے ناشتے کے لئے وہ سروٹوں کے ذخیرے کے درمیان پوشیدہ اس آخری پڑاؤ میں واپس نہیں آیا تھا جہاں پچھلے شب آگ کی سرخ توانائی کی بھڑکتی لگتی اور پھر ٹھنڈی ہوتی

زبانوں کے گرد وہ تینوں جھومر ڈالتے تھے.. اسی لئے وہ صاحب کا ناشتہ لے کر ادھر آ رہا تھا..

ابھی ہلکی دھند تھی جو سندھ کے پانیوں پر تیرتی تھی.. جیسے تخلیق کے پہلے دن تیرتی تھی.. لیکن ابھی یہ حکم نہیں اترتا تھا کہ روشنی ہو جا.. صرف طلوع کا ٹیلا سونا تھا جو سندھ سائیں کی آبی چادر پر بچھا ہوا دکھائی دیتا تھا جس کے کنارے وہ کشتی فہیم کے آخری ناشتے کے قریب آتی جاتی تھی جس کے اندر صاحب ابھی تک سوتا تھا..

کشتی کے تختوں پر جو گل بوٹے نقش تھے وہ بھی ہلکی دھند میں دھندلاتے تھے پر آہستہ آہستہ قربت میں آنے پر دکھائی دیتے جاتے تھے..

فہیم نے چھابے میں دھرے پرائے کو اپنی پوروں سے چھوا.. ابھی تک گرم تھا.. انڈے کی زردی میں بھی ایک نامعلوم سی حدت قائم تھی اور پھر اس نے اپنا گنگنا موقوف کر کے کشتی کے اندر جھانکا..

”ناشتہ کریں گے سائیں..“

سائیں.. اپنے سیلینگ بیگ میں منہ کھولے.. بے سندھ پڑا تھا..

سندھ ساگر کی اس سویر میں.. انڈس کوئین کو غازی گھاٹ کے پانیوں سے دور ہوئے.. بیکار رنگ آلود جنگ میں بدلے.. کھیتوں کی سبز روئیدگی میں خشک اور بے بس پڑے.. رنگ کے ذروں میں روپوش ہوئے.. سنیرنگ و ہیل کے نیچے گئے کے پھوک.. ایک مردہ لائف جیکٹ.. عرشے پر برہنہ حالت میں ایک کموڈ.. صوفوں میں سے نکلتے گولا سپرنگ.. دھجیوں میں بکھرا بے رنگ قالین.. شکستہ اور کھنڈر ہوئے انڈس کوئین کو جب مدتیں گزر چکی تھیں اور وہ کسی دیوانے کے خواب میں ہی دوبارہ سندھ کے پانیوں پر رواں ہو سکتی تھی.. وہی خواب جس میں پو آ جی کا لکڑی کا جہاز اڑتا تھا اور ان کی سفید لٹیں ایک عیسے کی مانند ان کے ریشمی کندھوں پر لہراتی تھیں..

جب ایک سرخاب کے پر پاؤں کی دھمک سے فضا میں بلند ہوتے تھے اور ہر پر ایک

سرخاب میں بدلتا تھا..

اپنی پیاری جان کے بچاؤ کے لئے جب ایک جل مرغی پانی میں بار بار ڈبکی لگاتی تھی اور اجل کی ڈور اس کے پیچھے سے بندھی اسے کھینچتی تھی کہ اس ڈور کے آخری سرے پر

مسلسل بھتی چلی جاتی تھی کیونکہ اس کی تار بل ڈوزر کے دانٹوں میں آکر کٹنے سے بچ گئی تھی۔

ایک بچے نے کھنڈر کی خاموشی میں کان لگا کر سنا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے... اس کے دونوں ہاتھ فارغ نہیں تھے۔ ایک میں وہ وادی کا لاش کا ایک چوہی گھوڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں محفوظ تھا اور دوسرے ہاتھ میں مٹی سے بھر ایک پرانا الارم کلاک تھا جس کی سوئیاں ابھی تک درست ہندسوں پر تھیں اور وہ بک بک کر رہا تھا۔ دوسرے بچے خزانے کی تلاش میں بلے کو کھود رہے تھے لیکن اسے ایک آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چوہی گھوڑے اور الارم کلاک کو ایک نیلے اور مٹی سے آلودہ چیترا نما سویٹر کے قریب رکھا۔ کان لگا کر غور سے سنا۔ پھر کچھ اینٹیں ہٹائیں جن کے نیچے خاک بسریلی فون دبا پڑا تھا اور اس کی گھنٹی کی آواز اینٹوں کے اٹھانے سے بلند ہو گئی تھی۔ اور اس کے چونگے کو اٹھا کر... جیسے وہ ایک پلاسٹک کا بنا ہوا کھلونا ٹیلی فون ہو۔ بچے نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے چیخ کر کہا۔

”ہیلو جی... کون ہے؟“

”خاور... کیا یہ آپ ہیں؟“

”ہاں جی...“ بچے کی خزانے کی تلاش میں یہ کوئی آواز تھی جسے وہ نہیں سمجھتا تھا۔ اور ہنستا جاتا تھا۔

”میں کو لمبے سے بات کر رہی ہوں۔ سلطانہ...“

”ہاں جی...“ بچے نے پھر کہا اور زور سے سر ہلایا کہ یہ تو زبردست کھیل تھا۔ ”یو ساؤنڈ سٹریٹ... لیکن میں پرسوں صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ رہی ہوں... تمہیں... آپ کو وہاں ہونا چاہئے... کیا... تم وہاں ہو گے؟“

بچے نے اپنے نیگے بازو پر اپنی ناک رکھ کر اسے پوچھا اور پھر ریسور کی تار کھینچ کر اس ٹیلی فون کو بھی چوہی گھوڑے اور الارم کلاک کے ساتھ اپنے خزانے میں شامل کر لیا۔

سائیں جاگتا تھا اور فہیم آوازیں دیتا تھا۔ کشتی کے اندر جھانکتا ہوا کہ... صاحب ناشتہ تیار ہے۔ صاحب منہ کھولے اپنے سلیپنگ میں بے سدھ پڑا تھا۔

شاہ حسین نہ تھا جو لگ چھپ لگ چھپ ڈور کھینچتا تھا بلکہ مونا بدھا عطا اللہ اپنے تہبند کو سنبھالتا اسے بھوننے کو کھینچتا تھا۔

ہنسوں کی چراگاہ کے آسمان پر ان کی ڈوروں کو پلٹتے۔ شور مچاتے۔ سندھ کے کناروں پر پانی پینے کے لئے آنے والے مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی سمفنی بلند ہو کر اسے ایک آبی مندر میں بدلتے۔ ٹن ٹن ٹن اور اندھی ڈولفینوں کی پشتوں پر ہومر کی سویریوں کی جٹائی انگلیوں کے اترنے کے بعد... مدتیں بیت چکی تھیں۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا جب فہیم نے کشتی میں جھانک کر کہا تھا۔

”ناشتہ کریں گے سائیں“

سائیں جاگتا تھا۔ اور فہیم نے دوبارہ پکارا۔

”ناشتہ کر لیں سائیں۔ باہر آکر منظر کشی کر لیں پھر... آج تو گھریار کو لوٹنا ہے“

لیکن سائیں۔ اپنے سلیپنگ بیگ میں منہ کھولے... بے سدھ پڑا تھا۔ اور جاگتا تھا۔

کھنڈر میں... بلے کے اندر... بارہ کھو کے مسہار شدہ بل ڈوزر کے دانٹوں سے کچلے ہوئے بام ودر کی تہہ میں... دبے ہوئے ایک ٹیلی فون کی گھنٹی بھتی چلی جاتی تھی۔

چونکہ خاور ایک ہتھیار ڈال دینے والے سپاہی کی مانند ہاتھ کھڑے کر کے۔ احتجاج کئے بغیر۔ درخواست گزار ہونے اور اپنی محرومی اور نا انصافی کا چرچا کئے بغیر ایک بیگ اٹھا کر چپکے سے رخصت ہو گیا تھا اس لئے اس کا گھر... بلکہ اس کی اینٹیں... کچھ دیواریں... بلے کے نیلے آس پاس کے گاؤں کے مکینوں اور ان کے بچوں کے لئے ایک خزانے کی تلاش بن چکے تھے۔ وہاں کھوج کرنے سے اور کھودنے سے کچھ بھی برآمد ہو سکتا تھا۔ شکستہ صوفے اور میزیں... کچن کاسٹک... کموڈ اور پانی کی ٹونیاں... دب چکے قالین... الیش ٹریز... دروازے... کھڑکیاں... الارم کلاک... پردے... ایک نیلا سویٹر... غرض کہ وہ ہر شے جو کسی گھر میں ہوتی ہے اور ہر گھر میں جگ سکتی ہے اس بلے میں سے دریافت کی جاسکتی تھی۔ اور وہاں کوئی والی وارث نہ تھا جو اس کی رکھوالی کرتا۔ اس لئے آس پاس کے لوگوں نے کھود کھود کر اس خزانے کو دریافت کیا اور اپنے گھروں کو لے گئے۔ صرف بلے کے اندر دفن ٹیلی فون کی گھنٹی

اور اس کے چہرے پر ایک مکھی بیٹھتی تھی.. کچھ دیر بیٹھتی تھی... اور بھنبھنا کر اڑتی تھی چہرے سے ذرا اوپر ہو کر اڑتی تھی اور پھر اپنے پروں کی بھنبھناہٹ موقوف کر کے اس کے چہرے پر بیٹھ جاتی تھی..

یہ کسی بھی موت کا.. سب سے پہلی... جہاں کوؤں نے آکر راہنمائی کی تھی... یا سب سے آخری... موت کا ماحول تھا یا نہیں.. صرف وہ ایک مکھی جانتی تھی جو سائیں کے ادھ کھلے منہ کے ہونٹوں پر.. کبھی ماتھے پر.. اور کبھی بالوں پر بیٹھتی تھی اور بھنبھنا کر اڑ جاتی تھی اور پھر آ بیٹھتی تھی..

اور اس مکھی سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا تھا کہ آیا تم جہاں بیٹھی ہو.. وہاں تمہارے باریک پاؤں تلے رخ بستگی کی مردہ ٹھنڈک اور مرگ ہے... یا تم زندگی کی آخری رمت پر بیٹھتی ہو اور تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی ایک رگ پھڑکتی ہے جو زندگی کی علامت ہے.. زندگی کی راکھ میں کوئی ایک چنگاری باقی ہے یا نہیں.. ایک مکھی سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا تھا..